www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

September-October 2024 • Rs. 40

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Sep-Oct, 2024 | Volume 49 | Issue 5

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹40 per copy
Subscription by Book Post	₹200 per year
Subscription by Regd. Post	₹400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

سب سے بڑا	4	کرنے کا کام	19
خدا اور انسان	5	دورِ امن کی طرف	23
رحمتِ خداوندی	6	نئی منصوبہ بندی	24
مقصدِ زندگی	7	مجموعۂ الفاظ	25
دریافتِ حق کی شرط	8	شخصیت کا ڈیولپمنٹ	26
خدا کا قانون	9	منفی سوچ کا طوفان	27
معیشتِ ضنک	10	تبدیلیوں کی حقیقت	28
ہونے والی بات	11	میں غلطی پر تھا	29
حکم اللہ کا	12	اصلاح کا طریقہ	30
امت کا امتحان	13	خوشی کا راز	31
شہادت علی الناس	14	مطالعۂ حدیث	32
احسان کا مقام	15	ڈائری 1986	37
مدعو سے شکایت	16	ایک انٹرویو	42
ماحول کا اثر نہ لینا	17	سوال و جواب	48
مدعو کا مطالعہ	18	حقیقت پسندی	50

विविधता का उसूल	1
अनेकता में एकता	2
तरक़्क़ी और एकता	3
अख़लाक़ी ज़हर	4
सृष्टि में एकत्व	5
सीमाबद्धता का नियम	6
ख़ुदा की हिफ़ाज़त में	9
इंसानियत के नमूने	12
ख़ुदा की तलाश	14
हज़ार मील का सफ़र	15
बड़ों को सभी के जनाज़ों में शामिल होना चाहिए	16

سب سے بڑا

نماز کے وقت موذن اونچائی پر کھڑا ہو کر بلند آواز سے پکارتا ہے: اللہ اکبر۔ یعنی اللہ سب سے بڑا ہے۔ اذان اور نماز دونوں ملا کر دیکھا جائے تو پانچ وقت کی نمازوں میں اللہ اکبر کا کلمہ روزانہ تقریباً تین سو بار دہرایا جاتا ہے۔ یہ کائنات کی سب سے بڑی سچائی کا اعلان ہے۔ یہ وہ پکار ہے جو سچائی کی دریافت پر انسان کی پوری شخصیت کی ترجمان بن کر آدمی کے دل سے نکل پڑی ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ دینِ اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت اِس بات کی ہے کہ ایک انسان، ایمان والا بن کر اللہ کی عظمت کو دریافت کرے۔ اللہ رب العالمین کی عظمت اس کے شعور کا سب سے زیادہ اہم حصہ بن جائے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک داخلی فطرت (inner core) ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے (الروم، 30:30)۔ جب انسان کا شعور سچائی کی طلب میں فطرت کے اس داخلی گوشہ (inner core) تک پہنچ جائے کہ اس کی اندرونی فطرت آخری حد تک جاگ اٹھے تو اسی کا نام معرفت ہے۔ اللہ کی معرفت انسان کی شخصیت کی بیداری کا وہ درجہ ہے جب کہ اس کی شخصیت اس طرح جاگ اٹھے کہ اس کا کوئی گوشہ جاگنے سے بچا ہوا نہ ہو۔

کسی انسان کی شخصیت میں جب اس قسم کا انقلاب آتا ہے تو وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کا سول کنسرن (sole concern) صرف اللہ بن جاتا ہے۔ اس کی ساری وفاداری ایک اللہ کے لیے ہو جاتی ہے۔ اللہ اس کی طلب کا مرکز بن جاتا ہے۔

اس کی زبان سے ایسے الفاظ نکلنے لگتے ہیں جو اس سے پہلے نہیں نکلے تھے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے جیسے کہ اللہ اس کا سب کچھ بن گیا ہے، یہ انسانی دریافت کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ دریافت کی اس سطح پر پہنچ کر آدمی کے دل سے جو دعائیں نکلتی ہیں اس کی ایک مثال قرآن میں آسیہ بنت مُزاحم کی دعا ہے۔ جب فرعون اس کو قتل کرنے کے لیے تلوار لے کر کھڑا ہو گیا تو اس وقت آسیہ کی زبان سے دعا کے جو الفاظ نکلے اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (66:11)۔ اے میرے رب میرے لیے ایک گھر بنا دے اپنے پاس جنت میں۔ یہ دعا اللہ کی گہری دریافت سے نکلی ہوئی دعا ہے۔

خدا اور انسان

آج انسان ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جو مکان وزمان (space and time) پر مبنی ہے۔ اس دنیا میں خدا رب العالمین کی حیثیت سے ایک سرے پر ہے اور انسان مخلوق کی حیثیت سے دوسرے سرے پر۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ زمان ومکان کی حدیں ختم ہوجائیں۔ وہاں پر خدا کہاں ہوگا اور انسان کہاں ہوگا۔ کیا دونوں پھر بھی الگ الگ ہوں گے یا دونوں ایک ہوجائیں گے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ خدا ایک لامحدود ہستی (unlimited being) ہے۔ خدا ہی اول ہے اور وہی آخر (الحدید، 57:3)۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ خدا ایسا اس لیے ہے کہ وہ خالق ہے۔ انسان ایسا نہیں، کیوں کہ وہ مخلوق ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان یہ فرق ہمیشہ باقی رہے گا۔ وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ خدا لامحدود ہے اور وہ ہمیشہ لامحدود (unlimited) ہی رہے گا۔ اس کے مقابلہ میں انسان لمیٹڈ ہے اور وہ ہمیشہ لمیٹڈ ہی باقی رہے گا۔ کسی کو یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اس ایکویشن (equation) کو بدل دے۔ خدا اور بندے کے درمیان یہ پوزیشن کبھی بدلنے والی نہیں۔ اس موضوع سے متعلق تمام سوالات کا جواب یہی ہے۔ یہ جواب اتنا زیادہ حتمی ہے کہ اس میں کبھی تبدیلی آنے والی نہیں۔ اس مسئلہ پر جو سوالات کیے جاتے ہیں وہ سب غیر منطقی (illogical) ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو زمان ومکان کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں خدا ایک ایسی ہستی ہے جو زمان ومکان سے ماورا (beyond space and time) ہے۔ ایسی حالت میں انسان کے لیے اس معاملہ میں صرف ایک آپشن ہے۔ وہ یہ کہ اس فطری حقیقت کو وہ بطورِ واقعہ مان لے، نہ کہ اپنے محدود ذہن کے ساتھ اس کی توجیہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس معاملہ میں حقیقت واقعہ یہ ہے کہ انسان مخلوق ہے، وہ خالق نہیں بن سکتا۔ خدا خالق ہے، وہ مخلوق نہیں۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ مخلوق کی اصطلاحوں میں ایکسپلین (explain) ہو سکے۔

رحمتِ خداوندی

قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے:

کہو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیوں کہ اللہ تمام گناہوں کو بخشنے والا ہے (39:53)۔

اس آیت سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معافی کا یہ معاملہ اپنے آپ ہو جاتا ہے۔ بندہ غلطی کرتا رہتا ہے اور اللہ خود بخود اس کو معاف کرتا رہتا ہے۔ مگر بات یہ نہیں ہے۔ اس آیت کے درمیان ایک چیز بظاہر غیر مذکور ہے۔ لیکن قرآن کے اسلوب کی بنا پر یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ یہاں یقینی طور پر موجود ہے۔ وہ بات یہ کہ بندہ غلطی کرنے کے بعد معافی مانگے تو اللہ کی رحمت کا تقاضا ہوگا کہ وہ اس کو معاف کر دے۔

یہ بات ایک عام انسان کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ اس انسان کے لیے ہے جس کے اندر اس کا ضمیر زندہ ہو۔ غلطی کرنے کے بعد اس کے اندر شرمندگی (repentance) کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ وہ شدید احساس کے ساتھ اللہ سے معافی کا طالب بن جاتا ہے۔ شدید احساس ندامت کی بنا پر اس وقت وہ ایسے الفاظ بولتا ہے جو اللہ کی رحمت کو طلب (invoke) کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس کی غلطی صرف عام قسم کی غلطی نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد شدت ندامت کی بنا پر اس کے اندر ایک نئی شخصیت ایمرج (emerge) کرتی ہے۔ وہ گناہ سے پہلے جیسا انسان تھا وہ گناہ کے بعد اس سے مختلف ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ جب انسان کی غلطی اس کے لیے داخلی انقلاب کا ذریعہ بن جائے تو اس کا کیس ایسا کیس بن جاتا ہے جو اللہ کی رحمت کو اِن ووک کر دے۔ اور اللہ اپنی رحمتِ خاص کی بنا پر اس کے لیے معافی کا اعلان کر دے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اللہ اپنی رحمت سے بندے کے ہر گناہ کو بخش دیتا ہے مگر یہ وہی بندہ ہے جس کا گناہ اس کی شخصیت میں اتنا زیادہ انقلاب لائے کہ اس کے بعد وہ ایک نیا انسان بن جائے۔

مقصدِ زندگی

قرآن کی ایک آیت بتاتی ہے کہ انسان اور جن کو اس لیے پیدا کیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں (52:56)۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وہ عبادت مراد ہے جس کو مبنی بر معرفت عبادت کہہ سکتے ہیں۔ فضیل بن عیاض (وفات 187ھ) کا قول ہے کہ مومن کا کلام حکمت ہوتا ہے، اس کی خاموشی غور وفکر ہوتی ہے، اور اس کا دیکھنا عبرت کے لیے ہوتا ہے۔ اگر تم ایسے ہو تو تم برابر عبادت کی حالت میں ہو (كَلَامُ الْمُؤْمِنِ حِكَمٌ وَصَمْتُهُ تَفَكُّرٌ، وَنَظَرُهُ عِبْرَةٌ إِذَا كُنْتَ كَذَلِكَ لَمْ تَزَلْ فِي الْعِبَادَةِ)۔ پھر اس کے بعد انھوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (52:56)۔ یعنی، میں نے جن اور انسان کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ (العظمۃ لابی الشیخ الاصفہانی، جلد 1، صفحہ 304)

معرفت یہ ہے کہ انسان تدبر وتفکر کرکے حقیقتِ حیات کو دریافت کرے۔ وہ اس حقیقت کو دریافت کے درجہ میں جانے کہ اس دنیا میں ایک طرف اللہ رب العالمین ہے اور دوسری طرف انسان ہے۔ اللہ رب العالمین ہر اعتبار سے کامل ہے۔ وہ خلّاق ہے، وہ علّام ہے، وہ رزّاق ہے۔ اس کے برعکس، انسان ہر اعتبار سے محتاج ہے۔ اس کی پوری زندگی عطیہ ہے۔ وہ دینے سے پاتا ہے، نہ دیا جائے تو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ انسان کے لیے معرفت یہ ہے کہ وہ قادر مطلق (all-powerful) خالق کو دریافت کرے۔ یہ شعوری دریافت آدمی کو اس قابل بنائے گی کہ وہ قادرِ مطلق خدا کے مقابلہ میں اپنے کو عاجز مطلق (all-powerless) ہونے کی دوسری انتہا (extent) پر رکھے۔ یہی انسان کا کمال ہے۔

جب کوئی انسان دریافت کے اس درجہ تک پہنچتا ہے تو اس کے اندر فطری طور پر ایک نئی شخصیت ایمرج (emerge) کرتی ہے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ اس کے اندر ایک نئی ربانی پرسنالٹی کو ڈیولپ کرے۔ یہی ترقی یافتہ انسان (developed man) آخرت میں احسن العمل انسان کا درجہ پائے۔ وہ جنت کے حسن رفاقت والے معاشرہ (النساء، 4:69) میں تاریخ کے منتخب انسانوں کے ساتھ ابدی طور پر رہے۔

دریافتِ حق کی شرط

قرآن کی سورہ نمبر 94-93 دوتوأم (twin) سورتیں ہیں۔ یعنی ایک ہی مشترک موضوع ہے جو دونوں سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ اِن سورتوں میں جو پیغام ہے، وہ پوری طرح اس وقت سمجھ میں آتا ہے، جب کہ دونوں سورتوں کا مطالعہ مشترک طور پر کیا جائے۔

سورہ نمبر 93 (الضحیٰ) میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ نے تم کو حقیقت کی تلاش میں سرگرداں پایا تو اس نے تم کو ہدایت (guidance) دی۔ اِس کے بعد سورہ نمبر 94 (الم نشرح) میں اس معاملے میں مزید وضاحت اِن الفاظ میں آئی ہے: أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ۔ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ یعنی اللہ نے تمھارا سینہ کھول دیا اور اُس بوجھ کو تمھارے اوپر سے اتار دیا جس نے تمھاری کمر توڑ رکھی تھی۔

سورہ الم نشرح میں "کمر توڑ دینے والے بوجھ" سے مراد وہی چیز ہے، جس کو سورہ الضحیٰ میں حقیقت کی تلاش میں سرگردانی (93:7) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت سے پہلے ایک اور حالت مطلوب ہے، یعنی قبل از ہدایت حالت۔ وہ یہ کہ آدمی پوری طرح متلاشیِ حق (truth seeker) بن چکا ہو۔ یہ تلاشِ حق اتنی شدید ہونا چاہیے کہ وہ اس کے لیے ایک ایسا ذہنی بوجھ بن جائے جس نے اس کے پورے وجود کو دبا دیا ہو۔ یہ دراصل سنجیدہ تلاش (sincere pursuit) کی آخری حالت کی تصویر ہے۔ جو شخص واقعی معنوں میں حق کا متلاشی ہو، اس کا حال وہی ہو جائے گا جس کی تصویر قرآن کی ان آیات میں بتائی گئی ہے۔

قرآن کی اِن آیتوں میں بظاہر ایک فرد، یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بیان ہوا ہے، لیکن یہ کوئی انفرادی بات نہیں، بلکہ وہ فطرت کا ایک عام اصول ہے۔ اِس دنیا میں سچائی صرف اس شخص کو ملتی ہے جو تلاشِ حق کے مذکورہ مرحلے سے گزرا ہو، جس شخص پر یہ مرحلہ نہ گزرے، اس کو سچائی کی دریافت بھی نہیں ہو سکتی۔ اِس معاملے میں کوئی بھی دوسری چیز گہری تلاشِ حق کا بدل نہیں۔

خدا کا قانون

اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز (وفات 101ھ) کو امت کے علما خلیفہ راشد خامس کا لقب دیتے ہیں۔ انھوں نے ایک سنت الٰہی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: إِنَّ اللّٰهَ تبارك وتعالى لَا يُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِذَنْبِ الْخَاصَّةِ، وَلَكِنْ إِذَا عُمِلَ الْمُنْكَرُ جِهَارًا، اسْتَحَقُّوا الْعُقُوبَةَ كُلُّهُمْ (موطا امام مالک: 3636)۔ یعنی اللہ کچھ لوگوں کے گناہ پر سب لوگوں کو عذاب نہیں دیتا، لیکن جب گناہ کھلے طور پر کیا جانے لگے تو سارے ہی لوگ سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

جب منکَر (گناہ کا فعل) کھلے طور پر ہونے لگے تو یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ سماج کے بقیہ لوگوں نے منکَر کو روکنے کا کام ترک کر دیا ہے، وہ اس معاملے میں بے تعلق (indifferent) ہو گئے ہیں۔ ایسا کرنے والے لوگ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ اللہ کے قانون کے مطابق، منکَر میں مبتلا افراد اگر براہِ راست طور پر اس میں شریک ہیں تو دوسرے لوگ بالواسطہ طور پر اس میں شریک ہیں۔ ایک گروہ اگر فعال طور پر (actively) جرم کا ارتکاب کر رہا ہے تو دوسرا گروہ منفعل طور پر (passively) جرم کے عمل میں شریک ہے۔ ارتکابِ جرم کے اعتبار سے، دونوں کے درمیان صرف درجے کا فرق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے، دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

یہ اصول دراصل ان لوگوں کی ذمہ داری کو بتا رہا ہے، جو بظاہر ارتکابِ جرم میں شریک نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں پر فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ وہ جرم میں مبتلا لوگوں کو نصیحت کریں، وہ خیر خواہی کے انداز میں لوگوں کو جرم سے باز رکھنے کی کوشش کریں، وہ ہر موثر تدبیر کے ذریعے اصلاحِ حال کی جدوجہد کریں۔ وہ ایسے لوگوں کی اصلاح کے لیے اللہ سے دعا کریں، وہ اپنی متحدہ کوشش کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کریں جو مجرمین کی حوصلہ شکنی کرنے والے ہوں — اس مصلحانہ کوشش کو قرآن وحدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ اس معاشرے میں کوئی خیر نہیں جس کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہ مصلحانہ عمل جاری نہ ہو۔ اس عمل کو آج کی زبان میں تنقید (criticism) کا نام دیا جا سکتا ہے۔

معیشتِ ضنک

قرآن کی ایک آیت ہے: وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (20:124)۔ یعنی، جو شخص میری نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا۔ اس میں مَعِيشَةً ضَنْكًا سے غربت وافلاس مراد ہے یا کوئی دوسری چیز۔ (ایک قاری الرسالہ، یوپی)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اطمینان قلب کا تعلق معاشی فراوانی سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق مثبت طرزِ فکر سے ہے۔ اگر آپ فطرت کے اصول کو سمجھیں، اور اس کے مطابق زندگی گزاریں تو آپ کو فطری طور پر اطمینان قلب حاصل ہوگا، کم یا زیادہ آپ کو شرح صدر حاصل رہے گا۔ آپ ایک حقیقت پسند انسان بن جائیں گے، جو کہ بلاشبہ اطمینان قلب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ یہی بات ایک حدیثِ رسول میں اس طرح کہی گئی ہے: اس شخص کے لیے خوش خبری ہے جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور بقدرِ ضرورت روزی ملی۔ اور اس نے قناعت کا طریقہ اختیار کیا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2504)۔

دوسری طرف معیشتِ ضنک (تنگ زندگی) کا تعلق مشکل معیشت سے نہیں ہے، بلکہ منفی طرز فکر سے ہے۔ اگر آپ کا طرز فکر مثبت ہو، تو ہر صورتِ حال میں آپ کو اطمینان قلب حاصل رہے گا۔ تنگی اور فراخی دونوں میں آپ معتدل زندگی گزاریں گے۔ آپ ہر صورتِ حال کو مینج (manage) کرنے کا فن جان لیں گے۔ آپ نارمل حالت اور بحران کی حالت دونوں کو معتدل انداز میں نبھانے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس کے خلاف جو زندگی بنتی ہے، اسی کو معیشت ضنک کہا گیا ہے، اور اس کے مطابق جو زندگی ہو، وہی فراخی والی زندگی کہی جائے گی۔

مثلاً اگر کوئی شخص اللہ کے ذکر پر قائم ہو، یعنی وہ یہ جانے کہ انسان کی پیدائش کے معاملے میں اللہ کا تخلیقی نقشہ کیا ہے، تو وہ اس حقیقت کو جانے گا کہ اللہ کا تخلیقی نقشہ انسانی آزادی کے اصول پر قائم ہے۔ یعنی آپ کو جس طرح اس دنیا میں قول وفعل کی آزادی حاصل ہے، اسی طرح دوسروں کی بھی قول فعل کی آزادی حاصل ہے۔ ایسی حالت میں آپ دیکھیں کہ اگر کوئی شخص آپ کے نظریے کے خلاف بول رہا ہے، تو آپ کو غصہ نہیں آئے گا۔ آپ مذکورہ شخص سے ڈسکشن کریں گے، نہ کہ اس کے خلاف منفی سوچ کا شکار ہو جائیں گے۔

ہونے والی بات

میری زندگی میں کئی حادثات ہوئے۔ ان میں سے ایک حادثہ اتنا شدید تھا کہ میں کئی سال تک اس کے لیے غمگین بنا رہا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ میرا غمگین ہونا بے فائدہ تھا۔ کیوں کہ جو ہونے والا تھا، وہی ہوا۔ میرے غم سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس طرح کے تجربات کو لے کر میں ایک رائے پر پہنچا ہوں۔ یہ رائے مبنی بر عقیدہ نہیں ہے، بلکہ مبنی بر تجربہ ہے۔ وہ یہ کہ حالات کی نسبت سے جو ہونے والا تھا، آخر کار وہی ہوا۔ میرے غم کرنے سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ان تجربات کے بعد میں سمجھا ہوں کہ حقیقت پسندی کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے مواقع پر آدمی سارے معاملے کو خدا پر ڈال دے۔ کیوں کہ تجربہ بتاتا ہے کہ ہمارے اختیار میں صرف دعا کرنا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن کی ایک آیت کا مطلب غالباً یہی ہے۔ وہ آیت یہ ہے: مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۔ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (57:22-23)۔ یعنی کوئی مصیبت نہ زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں، بیشک یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔ تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے کھویا گیا۔ اور نہ اس چیز پر فخر کرو جو اس نے تم کو دیا۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی چیز کا ملنا یا کسی چیز کا چھننا دونوں امتحان (test) کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیشگی طور پر مقرر فرما دیا ہے کہ کس شخص کو اس کے امتحان کا پرچہ کن کن صورتوں میں دیا جائے گا۔ آدمی کو اصلاً جس چیز پر توجہ دینا چاہیے وہ یہ نہیں کہ اس کو کیا ملا اور اس سے کیا چھینا گیا بلکہ یہ کہ اس نے کس موقع پر کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ صحیح اور مطلوب ردعمل یہ ہے کہ آدمی سے کھویا جائے تو وہ دل برداشتہ نہ ہو اور جب اس کو ملے تو وہ اس کی بنا پر فخر و غرور میں مبتلا نہ ہو جائے۔

حکم اللہ کا

اسلام کی ایک تعلیم قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے: إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (12:40)۔ یعنی حکم صرف ایک اللہ کا ہے۔ اس طرح کی آیات میں حکم کا لفظ سیاسی حکم (political rule) کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ فوق الطبیعی حکم یا کائناتی حکم (universal rule) کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب پولٹکل سائنس کی کتابوں سے نہیں معلوم ہوگا، بلکہ اس کا مطلب قرآن کی آیتوں میں غور وفکر سے معلوم ہوگا۔

اس طرح کی آیتوں میں حکم کا لفظ اس قانون کے لیے نہیں آیا ہے، جو اسمبلی میں یا پارلیمنٹ میں بنایا جاتا ہے، اور جس کو وزیر قانون یا عدالت کے جج نافذ کرتے ہیں۔ بلکہ اس طرح کی آیتوں میں حکم سے مراد وہ برتر حکم ہے، جو اللہ رب العالمین نے براہ راست طور پر اپنے فرشتوں کے ذریعہ عالم وجود میں نافذ کر رکھا ہے۔ یعنی وہ حکم ہے، جس میں تدبر کرنے سے انسان کے اندر شکر اور عبادت کی اسپرٹ پیدا ہوتی ہے، جو آدمی کو اس بات کے لیے آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس دنیا میں شاکر اور عبادت گزار بن کر زندگی گزارے۔ مثلاً سورج کا نکلنا، آکسیجن کی سپلائی کا نظام، بارش کا نظام، زمین سے غلہ پیدا ہونا، ہواؤں کا چلنا، زمین پر قائم لائف سپورٹ سسٹم کا نظام، وغیرہ، اور اس طرح کی بے شمار چیزیں جو اس دنیا میں انسان کو فطرت کے نظام کے تحت حاصل ہیں۔ یہ سب نظام اللہ رب العالمین کے حکم کے تحت وقوع میں آتے ہیں۔ اسی کو سورہ الرعد میں تدبیرِ امر کہا گیا ہے (13:2)۔ اس حکم کی دریافت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ انسان اللہ رب العالمین کا شکر ادا کرے، اور اللہ کو اپنا معبود سمجھ کر صرف اسی کی عبادت کرے۔

اگر کوئی شخص اس طرح کی قرآنی آیتوں کو لے کر دنیا میں سیاسی تحریک چلائے، اور حکمرانوں کو قیادت سے بے دخل کرنے کے لیے ان سے لڑائی شروع کر دے تو یہ اس حکم کی تعمیل نہیں ہوگی، بلکہ اس حکم کے نام پر ایک تخریب کاری کی سیاست چلانا ہوگا۔ یہ اللہ کے نام پر سرکشی کے عمل کا ارتکاب ہوگا۔ قرآن کی اس طرح کی آیتوں کا کوئی تعلق پولیٹکل ایکٹوزم (political activism) سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تمام تر تعلق اس سے ہے کہ انسان اس دنیا میں رحمٰن کا سچا بندہ (الفرقان، 25:63-74) بن کر زندگی گزارے۔

امت کا امتحان

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن دعوت الی اللہ کا مشن تھا۔ اس کام کی مطلوب انجام دہی کے لیے آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ ہرگز ''رکون'' نہ کریں۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور ان کی طرف نہ جھکو (وَلَا تَرْكَنُوا) جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے (11:113)۔

رُکون کے معنی ہیں جھکاؤ (tilt)۔ یعنی قوم کے تقاضے، لوگوں کا دباؤ، حالات کی مصلحت، اس قسم کی مختلف چیزیں داعی کے اندر رکون کا ذہن پیدا کرتی ہیں۔ لیکن پیغمبر کو سختی کے ساتھ حکم تھا کہ وہ کسی بھی دباؤ کو قبول نہ کرے۔ وہ سختی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں پر قائم رہ کر اپنا دعوتی مشن جاری رکھے۔

دعوت کے مشن میں استقامت کا یہ اصول جس طرح پیغمبر کے لیے تھا۔ اسی طرح پیغمبر کی امت کے لیے بھی ہے۔ اس معاملہ میں امت اپنے پیغمبر کی نمائندہ ہے اور نمائندہ کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ اس معاملہ میں کسی بھی دباؤ کو قبول کر کے اصل مشن میں کسی قسم کی تبدیلی کرے۔ اگر وہ تبدیلی کا ارتکاب کرے تو اس کے لیے بھی یقینی طور پر اسی پکڑ کا اندیشہ ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں پیغمبر کے لیے کیا گیا۔

دعوت الی اللہ کے کام کے لیے یہ لازمی شرط ہے۔ اس شرط کے بغیر دعوت الی اللہ کا کام درست طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اور جب دعوت الی اللہ کا کام درست طور پر انجام نہ دیا جائے تو وہ مقصد ادا نہیں ہوتا جو دعوت الی اللہ کا مطلوب ہے، یعنی قوموں پر اللہ کی حجت ادا نہیں ہوتی (النساء، 4:165)۔

دعوت الی اللہ کا کام ایک مختلف نوعیت کا کام ہے۔ اس میں دوسرے تمام تقاضوں کو الگ رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً قومی تقاضے، مادی تقاضے، وغیرہ۔ ان تقاضوں سے بچتے ہوئے دعوت کا کام کرنا بلاشبہ ایک سخت کام ہے۔ لیکن امت کو ہر حال میں یہ کرنا ہے کہ وہ دوسرے تمام تقاضوں کا اثر قبول نہ کرتے ہوئے اس خدائی مشن کو جاری رکھیں۔ یہی امت کا امتحان ہے۔ اس امتحان میں پورا ہونا امت محمدی کو امت محمدی بناتا ہے اور اگر امت اس امتحان میں ناکام رہے تو خود یہ امر مشتبہ ہو جائے گا کہ وہ اللہ کے یہاں امت محمدی کی حیثیت سے قبول کی جائے گی یا نہیں۔

شہادت علی الناس

مشہور پلے بیک سنگر مکیش چندر ماتھر (پیدائش 1923) امریکا کے ایک سفر میں تھے کہ 27 اگست 1976 کو ہارٹ اٹیک سے اچانک انتقال کر گئے۔ ان کے حالات جو اخباروں میں آئے ہیں، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ اردو زبان بہت اچھی جانتے تھے۔ ابتداءً وہ ہندی سے ناواقف تھے۔ بعد کو ضرورت کے تحت ہندی زبان سیکھی۔ کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی میں جو دس ہزار گانے ریکارڈ کرائے ہیں، ان میں سے ایک تلسی داس کی رامائن بھی ہے جس کو انھوں نے تین سال میں مکمل کیا تھا۔

1947 میں ہندستان آزاد ہوا تو برادرانِ وطن میں اس طرح کے بے شمار لوگ تھے جنھوں نے اپنے اسکولوں میں اردو پڑھی تھی۔ پنجابیوں کا سیلاب یہاں پہنچا تو اس طرح کے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی۔ آزادی کے بعد تقریباً چوتھائی صدی تک انڈیا کی عام زبان اردو ہی تھی۔ ہم نہایت آسانی کے ساتھ اردو کے ذریعہ ان سب لوگوں تک خدا کا وہ پیغام پہنچا سکتے تھے جس کے پہنچانے کی لازمی ذمہ داری بحیثیتِ امت مسلمہ ہمارے سپرد کی گئی ہے۔

اب یہ لوگ اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ دوسری نسل لے رہی ہے۔ داعی اور مدعو کے درمیان لسانی دوری بڑھتی جا رہی ہے، جو کام پہلے ہم اپنی مادری زبان میں کر سکتے تھے، اس کے لیے اب ہم کو دوسری زبانیں سیکھنی ہیں اور ان کے اندر مہارت پیدا کرنی ہے۔ ایک کام جو پہلے آسان تھا، مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود لوگ راتوں کو اطمینان کی نیند سوتے ہیں۔ شاید انھیں یاد نہیں رہا کہ انھیں مرنے کے بعد خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ جب خدا پوچھے گا کہ تم نے ہمارا پیغام ہمارے بندوں تک کیوں نہ پہنچایا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اور اگر ہم کو "خدا کی گواہی چھپانے" کا مجرم قرار دے دیا جائے تو ہمارے پاس اس سے بچنے کی کیا سبیل ہوگی۔ (الرسالہ، دسمبر 1976)

احسان کا مقام

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ أَبِي أُمَامَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمْ، قَالَ: حَبِّبُوا اللّٰهَ إِلَى عِبَادِهِ، يُحِبَّكُمُ اللّٰهُ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 7461)۔ یعنی ابوامامہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اللہ تعالیٰ کو لوگوں کے نزدیک محبوب بناؤ، اللہ تم لوگوں سے محبت کرے گا۔ ایک مرسل روایت میں یہ اضافہ ہے: وَحَبِّبُوا النَّاسَ إِلَى اللّٰهِ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (الاولیاء لابن ابی الدنیا، حدیث نمبر 43)۔ یعنی اور لوگوں کو اللہ کے نزدیک محبوب بناؤ، اللہ تم سب سے محبت کرے گا۔

لوگوں کی نظر میں اللہ کو محبوب بنانا اس طرح ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں، جو اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات میں پھیلا رکھی ہیں۔ اس کے بالمقابل لوگوں کو اللہ کی نظر میں محبوب بنانا اس طرح ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اللہ کی معرفت میں مشغول رہنے والا بنائیں۔ یہی حاصل ہے اس آیت کا، جس میں کہا گیا ہے کہ میں نے انسان اور جنات کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (52:56)۔ یعنی اور میں نے جن اور انسان کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

یہی حاصلِ دین ہے۔ اسی سے لوگوں کو خدا ملتا ہے، اور لوگ اس درجے کو پہنچتے ہیں، جہاں وہ حقیقی معنوں میں احسان کے درجے میں خدا کو پالیں۔ یعنی وہ اللہ کی عبادت اس طرح کرنے والے بن جائیں جیسے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہے ہوں اور اگر وہ خدا کو نہیں دیکھتے ہیں تو ان کو یقین ہو کہ اللہ ان کو دیکھ رہا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 50)۔ اس حدیث رسول میں کسی بندے کے لیے وہ اعلیٰ درجہ بتایا گیا ہے، جب کہ وہ حقیقی معنوں میں اللہ کا عبادت گزار بن جائے۔ ایسا انسان جب تدبر کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرتا ہے یا وہ خدا کا ذکر کرتا ہے تو اس کو بلاشبہ اِن اعلیٰ کیفیات کا تجربہ ہوتا ہے جیسے کہ وہ اللہ سے ہم کلام ہے، جیسے کہ وہ اللہ سے ملاقات کر رہا ہے۔

مدعو سے شکایت

داعی سے مدعو کو شکایت ہونی چاہیے یا نہیں۔ اس سلسلے میں قرآن میں نبیوں کے حوالے سے ایک بیان ان الفاظ میں آیا ہے: وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَآ ءَاذَيْتُمُونَا (14:12)۔ یعنی جو تکلیف تم ہمیں دو گے ہم اس پر صبر ہی کریں گے:

"We will, surely, bear with patience all the harm you do us."

اس دعوتی اصول کی عملی تفسیر حدیث میں مذکور ایک واقعہ سے ہوتی ہے: صحابی رسول عبداللہ بن مسعود نے کہتے ہیں: كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم يَحْكِي نَبِيًّا مِنَ الأَنْبِيَاءِ ضَرَبَهُ قَوْمُهُ فَأَدْمَوْهُ، وَهْوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهِ، وَيَقُولُ: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لاَ يَعْلَمُونَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3477)۔ یعنی میں گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دیکھ رہا ہوں۔ آپ نبیوں میں سے ایک نبی کا واقعہ بیان کر رہے تھے کہ ان کی قوم نے انہیں مارا اور خون آلود کر دیا۔ وہ نبی خون صاف کرتے جاتے اور یہ دعا کرتے کہ اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما۔ یہ لوگ جانتے نہیں ہیں۔

مدعو کے خلاف شکایت کیوں نہیں ہونی چاہیے۔ اصل یہ ہے کہ شکایت سادہ طور پر صرف ایک برائی نہیں ہے، بلکہ وہ برائیوں کی جڑ ہے۔ جب انسان کے اندر شکایت پیدا ہوتی ہے تو پھر یہ ہوتا ہے کہ ایک برائی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری برائی پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی شکایت بہت سی دیگر برائیاں بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔

جب مدعو کے خلاف داعی کے دل میں شکایت پیدا ہوگی تو نتیجے کے اعتبار سے وہ مدعو کے خلاف ایک سے زیادہ برائیوں کو پیدا کرنے کا سبب بن جائے گی۔ اور نتیجتاً اس کے اندر داعیانہ ذہن کا خاتمہ ہو جائے گا اور دعوتی کام بھی جیو پرڈائز (jeopardize) ہو کر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبیوں نے مدعو کی طرف سے آنے والی ہر قسم کی پریشانیوں کو یک طرفہ صبر اور دعا کے ساتھ برداشت کیا، اور دل میں شکایت کو جگہ نہیں دی۔ مسلمان داعی ہیں، مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے مدعو سے یک طرفہ حسن تعلق قائم رکھیں۔

ماحول کا اثر نہ لینا

قرآن کی سورہ الفتح میں اصحاب رسول کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ یہ اوصاف اصحاب رسول کے حوالے سے اہل ایمان کے اوصاف ہیں۔ ان اوصاف میں سے ایک صفت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (48:29)۔ یعنی جو لوگ رسول اللہ کے ساتھ ہیں، وہ منکروں پر سخت ہیں، اور آپس میں مہربان۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام کے ساتھیوں کا کردار یہ ہے کہ وہ منکروں پر شدید (سخت) ہیں، اور آپس میں مہربان۔ اشداء علی الکفار عربی زبان کا ایک اسلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا انسان کسی کا فکری اثر قبول نہیں کرتا ہے۔ وہ فکری اعتبار سے نہایت مضبوط شخصیت (strong personality) والا ہے۔ وہ اپنے اختیار کردہ اصول کے معاملے میں رُکون (ہود، 11:113) کا طریقہ اختیار نہیں کرتا ہے۔ وہ ماحول کی پیداوار (product) نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے سوچے سمجھے اصول پر قائم رہنے والا انسان ہے۔ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہیں کرتا، بلکہ وہ ہمیشہ وہی کرتا ہے جس کو وہ حق کے اعتبار سے درست سمجھتا ہے۔ اس معاملے میں وہ ایک بے لچک انسان ہے۔ اس کی شخصیت حالات کے دباؤ کے تحت نہیں بنتی، بلکہ خود اپنے عزم اور اپنے ارادے کے تحت بنتی ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے، جو ہر حال میں اپنے مضبوط کردار پر قائم رہتا ہے۔

اس بات کو ایک اور انداز سے اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مومن ایک صاحب مشن انسان ہوتا ہے۔ خدا کی کتاب میں تدبر کی بنا پر اس کی ایک سوچی سمجھی رائے ہوتی ہے۔ یہ رائے اس کو ایک مضبوط کردار کا آدمی بنا دیتی ہے۔ وہ حالات کی پیداوار نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مشن یہ ہوتا ہے کہ وہ حکمت کے ساتھ حالات کو صحیح رخ کی طرف موڑ دے۔ اس کا رویہ مفاد پرستی کا رویہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک مصلح اور خیر خواہ انسان کا رویہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے کردار کے اعتبار سے اثر ڈالنے والا ہوتا ہے، نہ کہ اثر قبول کرنے والا۔

مدعو کا مطالعہ

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ کچھ نوجوانوں پر میں دعوت کا کام کر رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ خدا اور آخرت کے بارے میں ان کے خیالات زیادہ واضح نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سے ملاقات کروں، اور ان کو خدا اور آخرت کے بارے میں زیادہ موثر انداز میں سمجھاؤں۔ اب بتائیے کہ میرا انداز کیا ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ابھی تک ان سے جو میری بات ہوئی، میرا اندازہ ہے کہ وہ ان کے لیے زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی۔

میں نے کہا کہ دعوت کا کام کسی سے پوچھ کر نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ خود مدعو کا مطالعہ کر کے کیا جاتا ہے۔ آپ کو یہ کرنا چاہیے کہ ہمدردی کے جذبے کے ساتھ ان سے ملیں، اور پیشگی طور پر کوئی رائے بنائے بغیر مدعو کی شخصیت کو سمجھیں، مدعو کس طرح سوچتا ہے، مدعو کا ذہن کہیں اٹکا ہوا ہے تو وہ کس پوائنٹ پر اٹکا ہوا ہے، مدعو کا ذہن اگر کنڈیشنڈ ذہن (conditioned mind) ہے، تو وہ کنڈیشننگ کیا ہے۔ ان سب باتوں کو جان کر یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ مدعو کا کیس کیا ہے، اس کے ذہن میں کس راستے سے داخلہ ممکن ہے۔ ان پہلوؤں کو سمجھنے کے بعد منصوبہ بند انداز میں اس کو اپنا مخاطب بنائیے، اور ان سے خالص آبجیکٹیو (objective) انداز میں بات چیت کیجیے۔ پھر مباحثہ یا ڈیبیٹ کے انداز سے مکمل طور پر پرہیز کرتے ہوئے خالص ناصحانہ انداز میں ان کے سامنے اپنی بات رکھی جائے۔

میرا تجربہ یہ ہے کہ خود بات کرنے سے پہلے آپ کو چاہیے کہ آپ اسلامی لٹریچر ان کو پڑھنے کے لیے دیں۔ اگر انھوں نے اسلامی لٹریچر کو پڑھ لیا تو ان سے دعوتی گفتگو کرنا آسان ہو جائے گا۔ دعوتی گفتگو کے لیے قرآن کی ایک آیت رہنما آیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقہ سے بات چیت کرو (16:125)۔ اور دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (41:34)۔

کرنے کا کام

ایک حدیثِ رسول مسند امام احمد میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے: عَن جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّ النَّاسَ دَخَلُوا فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا، وَسَيَخْرُجُونَ مِنْهُ أَفْوَاجًا (مسند احمد، حدیث نمبر 14696)۔ یعنی صحابی رسول جابر بن عبد اللہ نے کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو گئے عنقریب اسی طرح فوج در فوج وہ اس سے نکل جائیں گے۔

ایک شارح نے اس کی تشریح میں یہ الفاظ لکھے ہیں: وَذَلِكَ فِي آخر الزَّمَان عِنْد وجود الأشراط (التیسیر بشرح الجامع الصغیر، جلد 1، صفحہ 303)۔ یعنی یہ آخری زمانے میں ہوگا، قیامت کی نشانیوں کے وجود میں آنے کے وقت۔

ایسا کیوں ہے کہ آخری زمانے میں لوگ دین سے نکل جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں واقعہ یہ ہوا کہ لوگ قدیم روایتی شاکلہ میں جیتے تھے، تو ان کو دین سمجھانے کے لیے روایتی اسلوب اختیار کیا گیا جو ان کے مائنڈ کو ایڈریس کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ دور آیا، جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے۔ غالباً یہی وہ دور ہے، جس کی پیشگی اطلاع قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی تھی: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ یعنی عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں اور انفس میں۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔

لیکن یہ سائنسی زمانہ روایتی دور کے بالکل برعکس تھا۔ اس دور میں سائنسی دریافتوں کی وجہ سے انسان کی سوچ مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔ مثلاً قدیم دور میں توحید کے مقابلے میں توہم پرستی پر مبنی شرک تھا، اب توحید کے مقابلے میں قدیم شرک کے بجائے جدید الحاد کھڑا تھا۔ الحاد بظاہر سائنسی دلائل پر مبنی انکار خدا کا نظریہ ہے۔ اس دور میں اہل اسلام کو چاہیے تھا کہ وہ الحاد اور اس کے دلائل کو سمجھنے کی

کوشش کرتے۔ سائنسی دلائل (بہ الفاظ دیگر آفاق وانفس کی نشانیوں) کو استعمال کرتے ہوئے توحید کی حقانیت کو ثابت کرتے۔ مگر مغربی استعماری قوتوں سے سیاسی مغلوبیت نے مسلمانوں کو اس قدر منفی بنا دیا تھا کہ استعماری قوموں سے وابستہ ہر چیز بشمول سائنسی علوم اور سائنسی تہذیب کو دین کا دشمن سمجھ کر پوری شدت سے اس کی مخالفت میں مشغول ہو گئے۔

حالاں کہ اس وقت کرنے کا کام یہ تھا کہ الحاد کے مقابلے کے لیے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا مضبوط لٹریچر تیار کیا جاتا۔ تاکہ جو ذہن جدید تعلیم کی وجہ سے مذہب کے بارے میں عدم اطمینان کے شکار ہو رہے ہیں، وہ مذہب کے حق میں موجود دلائل کی بنا پر مذہب کے بارے میں شعوری طور پر مطمئن ہو جاتے۔ کیوں کہ جہاں بظاہر کچھ دلائل انکارِ خدا کے حق میں موجود تھے تو اس سے بھی زیادہ مضبوط دلائل اس حق میں موجود تھے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، جس نے اس دنیا کو ایک مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ لیکن نئے دور سے بے خبری کی بنا پر ہمارے علما نے اس قسم کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں پر ارتداد کا فتویٰ لگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ مذہب کے بارے میں کنفیوزن کا کیس تھے، وہ دین سے بیزاری کا کیس بن گئے۔ سلمان رشدی یا دوسرے افراد جن کو مسلمان مرتد یا شاتم کہتے ہیں، ان کا کیس اسی نوعیت کا ہے۔ جب میں نے تحقیق کی، اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے ملاقاتیں کیں تو معلوم ہوا کہ جدید انسان کا کیس ذہنی ارتداد (intellectual apostasy) کا کیس نہیں ہے، بلکہ وہ ذہنی عدم اطمینان (intellectual dissatisfaction) کا کیس ہے۔

ایک بار میری ملاقات ایک مدرسہ کے ذمہ دار سے ہوئی، انھوں نے سوال کیا کہ مدارس کے ذمے داران اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ اِن مدارس کے ذریعے تعلیم کا مقصد تو حاصل ہوا، لیکن افراد سازی کا مقصد بہت کم حاصل ہو سکا۔ اس کے جواب میں میں نے کہا کہ اِس کا سبب یہ ہے کہ قرآن کے مطابق، انسان کی شخصیت اس کے شاکلہ (17:84) کے مطابق بنتی ہے۔ شاکلہ سے مراد ذہنی سانچہ (mindset) ہے۔

ہمارے مدارس کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں کا پورا ماحول قدیم شاکلہ پر مبنی ہوتا ہے، جب کہ موجودہ

زمانے میں حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ دینی تعلیم کے نظام میں یہی وہ کمی ہے جس کی بنا پر ایسا ہو رہا ہے کہ مذہبی تعلیم کے عمومی پھیلاؤ کے باوجود ایسے افراد پیدا نہیں ہو رہے ہیں، جو جدید معیار پر اسلامی ذہن کے حامل ہوں، اور جدید انسان کے سامنے موثر انداز میں اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔ یہ صورتِ حال تقاضا کرتی ہے کہ مدارس کے طلبا کو لسانِ عصر سے آگاہ کیا جائے، تاکہ وہ اس قابل بن سکیں کہ وہ جدید ذہن کو ایڈریس کر سکیں۔

دین کو عصری اسلوب میں پیش کرنے کا حکم ہے، مگر مسلمان اس کو صرف اسلوبِ ماضی میں پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے— نئی دہلی کے ایک ہال میں مسلمانوں نے ایک جلسہ کیا۔ اس میں مسلمانوں کے ایک مشہور قائد نے تقریر کی۔ جلسہ میں ہندو صحافی اور دانشور بھی بلائے گئے تھے۔ تقریر کا خاص موضوع اسلامی شریعت تھا۔ ہال میں شاہ بانو کے معاملہ پر مسلمانوں نے جو زور و شور دکھایا ہے، اس کی وجہ سے غیر مسلموں میں شریعت کے بارے میں عمومی طور پر ایک تجسس پیدا ہو گیا ہے۔ یہ جلسہ 4 مئی 1986 کو ہوا۔ خصوصی مقرر نے پر جوش تقریر کی۔ مگر تقریر میں زیادہ تر اس قسم کی باتیں تھیں کہ شریعت ہم کو جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ہم کسی قیمت پر شریعت کے اندر مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتے، وغیرہ۔

ایک ہندو نے تقریر کے بعد کہا کہ موجودہ دور میں اس قسم کی باتیں قبول نہیں کی جا سکتیں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ ہماری شریعت میں لکھا ہے کہ بہو کو تیل چھڑک کر جلا دو تو کیا آپ اپنی بہو کو جلا دیں گے اور ملک خاموش رہے گا۔ آپ کو اپنے (شرعی) قانون کی معقولیت بتانی ہوگی۔ صرف دعویٰ کافی نہیں ہو سکتا۔

یہی موجودہ زمانہ میں ہمارے تمام لکھنے اور بولنے والوں کا حال ہے۔ "شتم رسول"، "قرآن کی بے حرمتی"، اور "مداخلت فی الدین" وغیرہ، کے نام پر وہ زبردست جوش دکھائیں گے، مگر دین کی معقولیت ثابت کرنے کے لیے محنت نہیں کریں گے۔ حالانکہ موجودہ زمانہ ہر چیز کو عقلی سطح پر سمجھنے کا زمانہ ہے۔ آج کا آدمی عقل کی سطح پر ہر چیز کو جانچتا ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ شریعت میں مداخلت کے نام پر ہنگامہ کھڑا کرتے رہتے ہیں، مگر شریعت کو زمانہ کے اسلوب میں پیش کرنے کے لیے وہ کچھ نہیں کرتے۔ ہندستان کے ایک معروف عالم دین نے ایک کتاب شائع کی تھی، اس کا ٹائٹل تھا: ردۃ ولا ابابکر لھا (ایک ارتداد ہے، لیکن اس کے مقابلے کے لیے کوئی ابوبکر نہیں)۔ اس کتاب کے مصنف نے اس نئے دور کو ارتداد کا دور کہا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے عملاً یہ بے خبری کا دور ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں پر شکایت اور نفرت کا ذہن غالب ہے، اس لیے وہ اِس دور کو سمجھ نہیں سکے۔

یہ سائنس کا دور ہے، جس کو قرآن میں آفاق وانفس میں خدائی نشانیوں کے ظہور کا دور کہا گیا ہے (41:53)۔ یہ سائنسی دریافتیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے کتابِ الٰہی میں مذکور کائناتی اشارات کی تفصیل ہیں، اور اسی کے ساتھ اس کی دلیل بھی۔ مگر بے خبری کی بنا پر پوری مسلم کمیونٹی اس دور کو مخالفِ اسلام دور سمجھ کر اس میں پیدا شدہ مواقع کو اویل کرنے سے محروم ہو کر رہ گئی۔ حالاں کہ یہ دین کی سائنسی تبیین کا دور ہے۔

مضمون کے ابتدا میں مذکور حدیث کو جب قرآن کی اس آیت کے ساتھ ملا کر سمجھا جائے تو اس سے گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں شرک کا مقابلہ کرنے کے لیے روایتی اسلوب میں اسلام کی سچائی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس سے لوگ فوج در فوج اسلام کی طرف آئے۔ یہی طریقہ الحاد کے مقابلے کے لیے اختیار کیا جانا چاہیے۔ یعنی وقت کے علمی مسلمات سے اسلام کی سچائی کو مدلل کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ فتویٰ کا طریقہ اپنا کر لوگوں کو دین سے مزید دور کر دیا جائے۔

راقم الحروف نے گہرے مطالعہ کے بعد اس دور کو پہچانا اور اس تعلق سے بڑے پیمانے پر عصری اسلوب میں جدید مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا لٹریچر تیار کیا ہے۔ 1976 سے الرسالہ مشن کے تحت منظم طور پر اِس نہج پر کام شروع کیا گیا تھا۔ اب سی پی ایس انٹرنیشنل کے تحت اس کام کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس لٹریچر کو مشن سے وابستہ لوگ اردو، ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں چھاپ کر وسیع پیمانے پر پھیلا رہے ہیں۔ اور اب اللہ کے فضل سے ہر جگہ اس کے مثبت اثرات سامنے آ رہے ہیں۔

دورِ امن کی طرف

قرآن میں اصحابِ رسول کو ایک حکم ان الفاظ میں دیا گیا تھا:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (8:39)۔ یعنی ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کا ہو جائے۔

قرآن کی اس آیت کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں کہا گیا ہے کہ "جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے" اور دوسرے حصہ کے الفاظ یہ ہیں کہ "دین سب اللہ کا ہو جائے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلے مطلوب کے لیے لڑنا ہوگا، اور اس کے بعد دوسرا مطلوب اپنے آپ حاصل ہو جائے گا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تخلیق کے مطابق انسانی دنیا میں حالت فطری قائم تھی۔ اور حالتِ فطری امن کی حالت ہے۔ بعد کو دنیا میں مطلق العنان بادشاہوں (despotic kings) کا زمانہ آیا۔ انھوں نے یہ کیا کہ حالت فطری کو ختم کر کے اس کی جگہ غیر فطری حالت قائم کر دی، یعنی جبر و تشدد کی حالت۔ یہ حالت اللہ کو منظور نہ تھی۔ اللہ نے اصحابِ رسول کو حکم دیا کہ جن لوگوں نے انسانی دنیا میں خود ساختہ طور پر جبر و تشدد کی حالت قائم کر رکھی ہے، اس کو بزور ختم کر دو تا کہ دوبارہ انسانی دنیا میں حالت فطری قائم ہو جائے۔

قدیم زمانہ میں مذہبی تشدد (religious persecution) اسی جبر کی بنا پر قائم تھا۔ اصحاب رسول نے اپنے زمانہ کے ارباب اقتدار سے جنگ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں ایک نیا دور آ گیا۔ یعنی جنگ کے دور کے بجائے امن کا دور۔ تاریخ میں کوئی بڑا واقعہ اچانک نہیں ہوتا بلکہ وہ تاریخی عمل (historical process) کی صورت میں ابتدائی حالت سے شروع ہو کر تکمیل کی حالت تک پہنچتا ہے۔ تاریخ میں اس دور امن کا آغاز اہلِ اسلام نے کیا تھا۔ بعد کے زمانہ میں آزادی اور جمہوریت (freedom and democracy) کا جو دور آیا وہ اسی آغاز کا انتہا (culmination) ہے۔

اکیسویں صدی میں اب ہم اسی دور امن میں جی رہے ہیں۔ اب قرآن کے الفاظ میں دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو چکا ہے۔ یعنی یہ ممکن ہو گیا ہے کہ پر امن طریق کار (peaceful method)

کو استعمال کرتے ہوئے ہر مقصد کو نارمل طریقے سے حاصل کرلیا جائے۔

اسلام ایک مشن ہے، توحید کا مشن۔ قدیم زمانہ میں اس مشن کو جاری کرنے کے لیے سخت رکاوٹیں پیش آئی تھیں۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ رکاوٹوں کے بغیر اسلام کے مشن کو جاری کیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں جو لوگ اسلام کا نام لیتے ہیں اور اسی کے ساتھ جنگ اور تشدد کا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ اپنے اس عمل سے یہ ثبوت دے رہے ہیں کہ دور جدید سے پوری طرح بے خبر (unaware) ہیں۔ ان کا کیس جہاد کا کیس نہیں ہے بلکہ بے خبری (unawareness) کا کیس ہے۔

نئی منصوبہ بندی

ری پلاننگ (re-planning) کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے منصوبہ میں تجربات کا اضافہ کرنا، اور نئی معلومات کی روشنی میں ازسرنو اپنے عمل کا نقشہ بنانا۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پہلے منصوبہ میں جو مقصد حاصل نہ ہوا ہو، اس مقصد کو دوبارہ بہتر انداز میں منظم کرکے ازسرنو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ری پلاننگ ہمیشہ یک طرفہ بنیاد (unilateral base) پر کی جاتی ہے۔ اس لیے ری پلاننگ عملاً ایک قربانی (sacrifice) کا عمل بن جاتا ہے۔ ری پلاننگ کے لیے انسان کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ردِّعمل (reaction) سے اپنے آپ کو بچائے۔ وہ کسی چیز کو وقار (prestige) کا مسئلہ نہ بنائے۔ وہ پیچھے ہٹنے کو اسی طرح قبول کرے جس طرح وہ اقدام کو قبول کیے ہوئے تھا۔ وہ کامل طور پر بے لاگ انداز میں سوچے اور حقیقتِ واقعہ کی بنیاد پر ایک فیصلہ لے۔ وہ ہار اور جیت کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر اپنی راہِ عمل متعین کرے۔

پیغمبر اسلام کے زمانے میں حدیبیہ کا معاہدہ اسی قسم کی ایک ری پلاننگ تھی۔ مگر مسلمان بعد کے زمانے میں اسوۂ رسول کے اس پہلو کو بھول گئے۔ حدیبیہ میں قیام امن کے لیے فریقِ ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لینا، باعتبارِ حقیقت ان کو اپنے اقدام کے لیے نیوٹرل (neutral) کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ یہ تدبیر موثر ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد بہت کم مدت میں پورا عرب ایک غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) کے ذریعہ اسلام کے زیر سایہ آ گیا۔

مجموعۂ الفاظ

کچھ مضامین ایسے ہوتے ہیں، جو مجموعۂ الفاظ تو ہوتے ہیں، مگر وہ مجموعۂ معانی نہیں ہوتے۔ مضمون لکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی پہلے غور وفکر کرکے ایک بامعنی تصور اپنے ذہن میں قائم کرے۔ پھر اس کو بامعنی الفاظ میں لکھے۔ ایسا مضمون صرف اس وقت آدمی لکھ سکتا ہے، جب کہ وہ جتنا وقت لکھنے میں لگائے، اس سے زیادہ وقت وہ اس سلسلے میں سوچنے میں لگائے۔ وہ اپنی باتوں کو پہلے سوچ کر ہضم کرے، اور اس کے بعد وہ الفاظ کی صورت میں اس کو بیان کرے۔ ایسا مضمون غور وفکر کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ انسان کو جو ٹیک اوے (takeaway) ملتا ہے، وہ اسی قسم کے مضمون سے ملتا ہے۔ بولنے یا لکھنے میں کلیرٹی (clarity) اس وقت آتی ہے، جب کہ آدمی مکمل طور پر غور وفکر سے کام لے۔

ایک حدیثِ رسول ہے: مَنْ صَمَتَ نَجَا (مسند احمد، حدیث نمبر 6481)۔ یعنی جو خاموش رہا، وہ نجات پا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو خاموش رہا، اس نے گہرائی کے ساتھ سوچا، اور جس نے گہرائی کے ساتھ سوچا وہ کامیاب ہوا۔

میں نے ایک تجربہ بار بار کیا ہے، کچھ لوگ بڑے بڑے اجتماعات میں جاتے ہیں۔ پھر جب وہ واپس آتے ہیں، اور ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اجتماع میں شرکت سے آپ کو کیا ملا۔ آپ کا ٹیک اوے کیا تھا۔ تو وہ کوئی خاص بات بتا نہیں پاتے۔ عمومی انداز میں وہ اجتماع کی بات بتا سکتے ہیں، لیکن جب متعین انداز میں پوچھا جائے تو ان کے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ اس طرح کی مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں کچھ نہیں ملا۔ کوئی قابلِ ذکر بات ان کو اس قسم کے شرکت سے نہیں ملی۔ کوئی ونڈر فل کی بات انھوں نے نہیں پائی۔

بامعنی تقریر وہ ہے جس کو سن کر آپ کے ذہن میں کچھ نئے خیالات پیدا ہوں۔ آپ کے دماغ میں کوئی حرکت پیدا ہو۔ آپ کو کچھ نئے آئڈیاز (ideas) سوچنے کو ملیں۔ جب ایسا نہ ہو تو سمجھ لیجیے کہ بولنے والے نے آپ کو الفاظ تو دیے، لیکن کوئی بامعنی (meaningful) بات وہ آپ کو نہ دے سکا۔

شخصیت کا ڈیولپمنٹ

کوئی شخص اگر اپنے عمل کا ایک نشانہ بنائے۔ وہ اس کے لیے عمل کرنا شروع کردے پھر وہ اپنے نشانہ کو پانے میں کامیاب ہوجائے تو یہ ایک کامیابی ہے۔ مگر وہ ایک چھوٹی کامیابی ہے۔ اس کے برعکس، اگر آدمی اپنے نشانہ کو پانے میں کامیاب نہ رہے تو یہ اس کے لیے زیادہ بڑی کامیابی کا زینہ بن سکتا ہے۔

وہ اس طرح کہ آدمی اگر اپنے نشانہ کو پانے میں کامیاب ہوجائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا سچوریشن پوائنٹ (saturation point) آ گیا ہے۔ یعنی وہ اپنے ترقی کے سفر کے خاتمہ (end) تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے برعکس، اگر وہ اپنے نشانہ کو پانے میں ناکام رہے تو اس کا سفر رکے گا نہیں۔ اس کا ذہن اپنے لیے نئے اَوینیو (avenue) کی تلاش میں لگا رہے گا۔ اس طرح بظاہر ناکام ہونے کے باوجود اس کا عمل برابر جاری رہے گا۔ وہ ایک کے بعد ایک نئی منزل کو پاتا رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقرر نشانہ (targeted goal) تک پہنچ جائے گا۔

آدمی اگر اپنے مقرر نشانہ تک پہنچ جائے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں سرگرمی کا پراسس رک جاتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھ کو جو کچھ پانا تھا میں نے پالیا۔ لیکن اگر آدمی مقرر نشانہ کو پانے میں ناکام رہے تو اس کے اندر ذہنی سرگرمی (intellectual development) کا پراسس برابر جاری رہے گا۔ پہلے اگر وہ صرف چل رہا تھا تو اب وہ جمپ (jump) کرنا شروع کردے گا۔ اس کے نتیجہ میں فطری طور پر ایسا ہوگا کہ ایک کے بعد ایک اس کے ذہن کی تمام کھڑکیاں کھل جائیں گی۔ اس کی شخصیت کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہے گا جو بند پڑا رہے۔ پہلے اگر وہ مین (man) تھا تو اب وہ سپرمین (superman) بن جائے گا۔ پہلے اگر وہ زیرو تھا تو اب وہ ہیرو بن جائے گا اس طرح فطری عمل کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے لیے ناکامی کا تجربہ پہلے سے بھی زیادہ بڑی کامیابی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

منفی سوچ کا طوفان

آج کل مسلمانوں کے جس اخبار یا میگزین کو پڑھا جائے، اس میں صرف ایک ہی بات کا چرچا ملے گا، اور وہ ہے "مخالفینِ اسلام" کا چرچا۔ اس طرح کی چیزیں سننے اور پڑھنے سے یہ تاثر بنتا ہے کہ اسلام ساری دنیا میں دشمنوں سے گھرا ہوا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسلام محاصرے میں ہے (Islam is under siege)۔ اس صورتِ حال کے لیے موجودہ زمانے میں ایک اصطلاح بن گئی ہے، جس کو عام طور پر اسلاموفوبیا (islamophobia) کہا جاتا ہے، وغیرہ۔ یہ مفروضہ سوچ بلاشبہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بے بنیاد ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا کے خالق نے دنیا کو چیلنج کے اصول پر بنایا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہاں ہمیشہ چیلنج اور مسابقت کی صورتِ حال باقی رہے۔ یہ صورتِ حال قانونِ فطرت کی بنا پر ہے، نہ کہ کسی کی دشمنی یا سازش کی بنا پر۔ اس لیے یہ صورتِ حال ہمیشہ جاری رہے گی۔ ہمارا کوئی بھی شور وغل اس صورتِ حال کو ختم کرنے والا نہیں۔ اس کے مقابلے میں ہم کو یہ کرنا پڑے گا کہ ہم صورتِ حال کا گہرا مطالعہ کریں، اور اس سے مقابلے کے لیے پرامن منصوبہ بنائیں۔ اس معاملے میں کوئی دوسرا آپشن ہمارے لیے نہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہماری تمام غوغا آرائی کے باوجود یہ صورتِ حال بدستور قائم ہے، اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ بھی وہ بدستور جاری رہے گی۔

ایسی صورت میں ہمارے لیے وہ آپشن نہیں ہے کہ ہم مفروضہ سازش کے خلاف غوغا آرائی کی بے نتیجہ سیاست کو جاری رکھیں۔ ہم کو لازمی طور پر یہ کرنا ہوگا کہ اپنے وقت کو مزید اس قسم کی بے فائدہ سیاست میں ضائع نہ کریں۔ بلکہ اس کے بجائے خالص بے لاگ انداز میں صورتِ حال کا مطالعہ کریں، اور اپنی تنزلی کے خاتمہ کے لیے غیر جذباتی انداز میں پرامن منصوبہ بنائیں۔ مثلاً ہمیں یہ کرنا ہے کہ ٹکراؤ کی سیاست کو مکمل طور پر ختم کردیں، اور پرامن انداز میں تعلیم وترقی کا منصوبہ بنائیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلمان موجودہ دور میں ترقی کی دوڑ میں پیچھے ہو گئے۔

اب مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ حقیقت پسندانہ انداز میں اس صورتِ حال کا جائزہ لیں، اور اپنی پسماندگی (backwordness) کو دور کرنے کے لیے جدید معیار پر منصوبہ بنائیں۔ مثلاً تعلیم کے میدان میں ریزرویشن کی مانگ کی سیاست کو مکمل طور پر ترک کردیں، اور اپنے نوجوانوں سے یہ کہیں کہ تم کو مسابقت (compatition) کے میدان میں آگے بڑھنا ہے، ریزرویشن کی مانگ سے تم کو کچھ ملنے والا نہیں۔

تبدیلیوں کی حقیقت

بمبئی کو دروازۂ ہند (گیٹ وے آف انڈیا) کہا جاتا ہے۔ اس کی علامت کے طور پر وہاں سمندر کے کنارے اس نام کا ایک گیٹ بنایا گیا ہے۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب کہ سمندر کے راستہ سے ہندستان آنے والے لوگ بمبئی کی بندرگاہ پر اتر کر ہندستان میں داخل ہوتے تھے۔ مگر اب سفری حالات بدل چکے ہیں۔ اب ہندستان کا دروازہ بمبئی کی سمندری بندرگاہ نہیں، بلکہ دہلی کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہے۔ اب بندرگاہوں کے بجائے ہوائی اڈوں کے ذریعہ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ تاہم یہ فرق طریقِ داخلہ کا فرق ہے، نہ کہ اصولِ داخلہ کا۔ اس سے دوسرے ملک کے شہریوں کے ہندستان میں داخل ہونے کے قوانین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ ایک مثال ہے، جس سے ان تبدیلیوں کی حقیقت سمجھی جاسکتی ہے، جس کے حوالہ سے مذہب میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ دنیا میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ یہ تبدیلیاں مذہب اور سماج کے درمیان پھر سے مطابقت کا تقاضا کرتی ہیں۔ مگر یہ صرف موجودہ حالات پر مذہب کے اصولوں کے ازسرِ نو انطباق (re-application) کا سوال ہے، نہ کہ خود مذہب کو بدل کر نیا مذہب بنانے کا— قدیم زمانہ میں جانور سواری کا کام دیتے تھے۔ آج سفر کے لیے مشینی سواریاں استعمال ہوتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک مسافر پورب کی سمت کے ایک مقام پر پہنچنے کے لیے پہلے پورب جاتا تھا، اب وہ اس کے لیے پچھّم کی طرف دوڑنے لگے گا۔ (الرسالہ مئی 1978)

میں غلطی پر تھا

"میں غلطی پر تھا (I was wrong)" کہنا کوئی سادہ بات نہیں۔ غلطی کا اعتراف اصلاح کا آغاز ہے۔ اگر آپ کوئی غلطی کریں تو اس کے بعد آپ کو سب سے پہلے یہ بولنا پڑے گا کہ "میں غلطی پر تھا، اب میں اس سے رجوع کرتا ہوں"۔ اعلان کے بغیر صرف اپنے عمل کو بدل لینا یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف غلطی کا احساس کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ بولیں کہ میں غلطی پر تھا۔

اگر اپنی غلطی کا اعتراف بول کر کریں تو آپ کے اندر ایک اصلاح کا پراسس جاری ہو جائے گا، اور اگر ایسا نہ کریں تو آپ بدستور جہاں تھے، وہیں باقی رہیں گے۔ غلطی کا اعلان دراصل اپنی اصلاح کا آغاز ہے بشرطیکہ آپ اس معاملے میں پوری طرح سنجیدہ ہوں۔ یعنی آپ صرف لپ سروس کے طور پر اپنی غلطی کا اعلان کرتے رہیں، لیکن اس کے مطابق، عمل کا آغاز نہ کریں تو ایسے قول بلا فعل کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہر اصلاح کے لیے سنجیدگی شرط ہے۔

انسانی زندگی میں کسی بڑے انقلاب کا آغاز اس وقت ہوتا ہے، جب کہ انسان کے اندر کوئی بریک تھرو (breakthrough) کا واقعہ پیش آئے۔ کوئی ایسا واقعہ جو انسان کے اندر وہ نفسیاتی بھونچال پیدا کرے جس کو برین اسٹارمنگ (brainstorming) کہا جاتا ہے۔ ایسا واقعہ جو انسان کی پوری شخصیت کو ہلا دے۔

اصل یہ ہے کہ عام حالت میں انسان کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند رہتی ہیں۔ اس بنا پر اس کی تمام صلاحیتیں بالقوۃ (potential) حالت میں پڑی رہتی ہیں، ان کو بالفعل (actual) بنانے کے لیے ایک انقلابی حرکت درکار ہے۔ اس انقلابی حرکت کا نقطہ آغاز صرف ایک ہے، اور وہ ہے اعترافِ خطا۔ یعنی یہ کہہ سکنے کی ہمت کہ میں غلطی پر تھا:

"I was wrong."

یہ اعترافِ خطا جتنا زیادہ شدید ہوگا، اتنا ہی زیادہ بڑا انقلاب آدمی کی شخصیت میں آئے گا۔ اس اعترافِ خطا کے اعلیٰ درجہ کو قرآن میں توبۂ نصوح (66:8) کہا گیا ہے۔

اصلاح کا طریقہ

سیرتِ رسول کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کے اصلاح کے لیے جو طریقہ اختیار کیا، وہ یہ تھا کہ آپ نے پہلے فکری مہم کے ذریعہ ان کے ذہنوں کو بدلا۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ قرآن میں سب سے پہلے ایسی سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ یعنی ان حقائق کا بیان جن سے فکر میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے (حَتَّى إِذَا ثَابَ النَّاسُ إِلَى الْإِسْلَامِ) تب حرام اور حلال کے احکام اترے۔ برعکس طور پر اگر پہلے ہی یہ نازل ہوتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو یا زنا نہ کرو تو وہ، زبانی یا عملی طور پر، ضرور یہ کہتے کہ ہم یہ سب کام نہیں چھوڑیں گے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4993)۔

عرب اگرچہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں، مگر طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے وہ اپنی تحریف شدہ سماجی روایت میں کنڈیشنڈ ہو چکے تھے۔ ان کو ڈی کنڈیشنڈ کرنا اسی وقت ممکن تھا، جب کہ ان کے ایک ایک فرد میں تبدیلی لائی جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طریقہ کو اپنا کر عرب کی سرزمین کو "ہیروؤں کی نرسری" میں تبدیل کر دیا۔ اس اصول کو آپ نے اس طرح بیان کیا ہے: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1)۔ مطلب یہ ہے کہ عمل کی بنیاد نیت پر ہے، اور کسی انسان سے وہی اعمال ظاہر ہوتے ہیں، جیسی وہ نیت کرتا ہے۔

(نیت یعنی سوچ و ارادہ)۔ اس انقلابی تبدیلی کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا وحید الدین خاں صاحب نے اپنے ایک سفرنامہ میں جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: "پہلی وحی کے طور پر قرآن میں اقرأ کا حکم آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خدائی کلام ہے۔ جب آپ کی نبوت کا آغاز ہوا اس وقت عرب میں بہت سے مسائل تھے۔ مثلاً کعبہ میں 360 بت، رومیوں اور ایرانیوں کی عرب علاقوں میں سیاسی دخل اندازی، سماج میں مختلف قسم کے جرائم، غربت اور پانی کی قلت، وغیرہ۔ مگر قرآن میں جو پہلی آیت اتری، اس میں ان مسائل کا ذکر نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائل خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں، ان کو نظر انداز کرتے ہوئے ہمیں اپنے عمل کا آغاز ہمیشہ علم اور شعور کی بیداری سے کرنا چاہیے۔ یہ نہایت اہم خدائی اصول ہے۔" آج بھی سماج کی اصلاح کے لیے یہی طریقہ کارگر ہے۔ (مولانا فرہاد احمد)

خوشی کا راز

خوشی (happiness) کا راز کیا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف رائیں ہیں۔ ایک آئی اے ایس افسر مسٹر اونیش سرن (@AwanishSharan) نے 21 مئی 2022 کو ایکس (سابق ٹوئٹر) پر ایک حقیقی ویڈیو شیئر کی، جس سے خوشی کے راز کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس خبر کو ہندستان ٹائمس نے بھی اپنی ویب سائٹ پر 22 مئی 2022 کو اس عنوان کے تحت شائع کیا ہے— سیکنڈ ہینڈ سائیکل خریدنے کے بعد باپ اور بیٹے کا اظہارِ خوشی آپ کے دل کو مسرت اور رحم کے جذبے سے بھر دے گا:

"Man and his son's reaction on buying a second-hand bicycle will melt your heart."

ویڈیو میں یہ دکھایا جارہا ہے کہ ایک غریب آدمی سیکنڈ ہینڈ سائیکل خرید کر اپنی چھوٹی سی جھونپڑی کے پاس لاتا ہے، اور خوشی خوشی اس کی آرتی اتارتا ہے، اور اس کا کم عمر بیٹا بھی خوشی سے اچھلتا اور ناچتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ مسٹر اونیش سرن نے اس ویڈیو کے لیے یہ بامعنی کیپشن دیا ہے— یہ صرف ایک سیکنڈ ہینڈ بائیسکل ہے، مگر ان کے چہرے کی خوشی کو دیکھیے، گویا انھوں نے مرسیڈیز بینز خرید لی ہو:

"It's just a second-hand bicycle. Look at the joy on their faces. Their expression says, they have bought a New Mercedes Benz."

اس خوشی کا راز کیا ہے۔ اس ویڈیو پر ونیت سود (@VineetSood15) نامی ایک صاحب نے بامعنی کیپشن لکھا ہے کہ "یہاں اصل چیز سائیکل یا کار نہیں، بلکہ وہ کتنا زیادہ قناعت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ زندگی بہت آسان ہے، ہم انسان مادی حرص کے ذریعہ اپنی زندگی کو مشکل بنا دیتے ہیں":

"The Issue is not a cycle or a car, but how contended they are. Life is very simple, but we burden it with material desires."

قناعت سادہ عمل نہیں۔ حرص خوشی کا قاتل ہے، اور قناعت خوشی کا دروازہ۔ اس سلسلے میں مولانا وحید الدین خاں کے الفاظ قابلِ غور ہیں کہ "قناعت کا جذبہ آدمی کے اندر یہ نفسیات پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک پایا ہوا انسان ہے۔ اور جو آدمی اپنے آپ کو پایا ہوا انسان سمجھے وہ کبھی جھنجھلاہٹ اور منفی سوچ کا شکار نہیں ہوسکتا"۔ (ماخوذ، الرسالہ جون، 2016) ڈاکٹر فریدہ خانم

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

(حدیث نمبر 157-152)

152

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دن دوپہر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی آواز سنیں جو قرآن کی ایک آیت میں اختلاف کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے۔ آپ کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اسی لیے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے خدا کی کتاب میں اختلاف کیا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2666)۔

تشریح: مسند احمد کی روایت (نمبر 3724) میں ہے کہ ایک مرتبہ دو اصحاب رسول قرآن کی کسی آیت کو لے کر اختلاف کرنے لگے تو آپ نے اس کو ناپسند کیا اور کہا کہ تم دونوں ٹھیک پڑھ رہے ہو، آپس میں اختلاف نہ کرو (كِلَا كُمَا مُحْسِنٌ فَلَا تَخْتَلِفُوا)۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں لازماً ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیدا ہوں۔ ایک اور دوسرے کے درمیان مختلف اعتبار سے اتنا زیادہ فرق پایا جاتا ہے کہ ہر انسان کو مسٹر ڈیفرنس کہنا صحیح ہوگا۔ اس دنیا میں ہر سماج فرق و اختلاف والا سماج ہے۔ یہ فرق و اختلاف چونکہ خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے اس لیے اس کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ فرق کے ساتھ نبھانے کا اصول اختیار کیا جائے، نہ کہ فرق کو مٹانے کا۔ فطرت کے اس اصول کا تعلق مذہبی معاملہ سے بھی ہے اور سیکولر معاملہ سے بھی۔ اس دنیا میں کوئی بھی نظام، مذہبی ہو یا غیر مذہبی، کامیاب طور پر وہی لوگ بنا سکتے ہیں جو ڈیفرنس مینجمنٹ کا آرٹ جانتے ہوں۔ فرق و اختلاف کو مٹانا نزاع پیدا کرتا ہے اور فرق و اختلاف کو مینج کرنا امن اور ہم آہنگی کا سبب بنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو انسان سے قرآن میں تدبر مطلوب ہے (ص، 38:29)، قرآن میں اختلاف

مطلوب نہیں۔ تدبر یہ ہے کہ استفادے کی نیت سے قرآن کی آیتوں میں غور وفکر کیا جائے۔ اس کے برعکس، اختلاف یہ ہے کہ قرآن کی آیتوں میں غیر ضروری بحثیں نکالی جائیں، اور رائے کے اختلاف (فرق) کو اختلافِ نزاع تک پہنچایا جائے۔

153

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جو ایک ایسی چیز کے بارے میں سوال کرے جو لوگوں کے اوپر حرام نہیں کی گئی تھی۔ پھر اس کے سوال کی وجہ سے وہ حرام کر دی گئی۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 7289، صحیح مسلم، حدیث نمبر 2358)

اس حدیث کی وضاحت قرآن کی ایک آیت سے ہوتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے: يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَسْئَلُوا عَنْ أَشْياءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (5:101)۔ یعنی، اے ایمان والو، ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو وہ تم کو گراں گزریں۔

مذکورہ آیت اور حدیث کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون سا سوال ہے جو اسلام میں ناپسند کیا گیا ہے۔ یعنی وہ سوال جس سے ایک انسان کے لیے آسانی کا راستہ کھلنے کے بجائے مشقت پیدا ہو جائے۔ اس قسم کے غیر ضروری سوالات میں پڑنے کی ممانعت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی وہی آج بھی مطلوب ہے۔ آج بھی صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو حکم جس طرح دیا گیا ہے اس کو اسی طرح رہنے دیا جائے۔ غیر ضروری سوالات قائم کر کے اس کی حدود و قیود کو بڑھانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس سے انسان مشکلوں میں پڑ جاتا ہے۔ آسان طریقہ وہ ہے جو مسئلے کو مسئلے تک محدود رکھے۔ اس کے مقابلے میں مشکل طریقہ وہ ہے جو اصل مسئلہ میں دوسرے مسئلے کا اضافہ کر دے۔

دین کی اصل روح اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں جب اندرونی روح سرد پڑتی ہے تو ظواہر کا زور بہت بڑھ جاتا ہے۔ اب غیر ضروری موشگافیاں کر کے نئے نئے مسائل بنائے جاتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں یہود کا یہی حال ہوا تھا۔ انھوں نے خدا کے دین کے نام پر ظاہری مسائل کی جکڑ بندیوں سے ایک خود ساختہ ڈھانچہ بنا لیا تھا اور اس کو خدا کا دین سمجھتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے ان

کے سامنے دین کو اس کی فطری صورت میں پیش کیا۔ غیر ضروری پابندیوں کو ختم کر کے سادہ اور آسان دین کی طرف انسانوں کی رہنمائی فرمائی۔ یہی سادہ اور آسان دین اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

154

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آخری زمانے میں بہت سے جھوٹے دجال ظاہر ہوں گے۔ وہ تم کو ایسی حدیثیں سنائیں گے جن کو نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمھارے باپ دادا نے سنا ہوگا۔ پس تم ان سے بچنا اور ان کو اپنے سے دور رکھنا۔ تا کہ وہ تم کو گمراہ نہ کریں اور تم کو فتنے میں نہ ڈالنے پائیں۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 707)

دجال سے مراد خدّاع ہے (لسان العرب، جلد 11، صفحہ 237)۔ یعنی بہت بڑا دھوکہ دینے والا۔ معمولی دھات کے برتن پر سونے کا پانی چڑھا کر اس کو سونا ظاہر کیا جائے تو اس کو بھی دجل کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انسانوں کے ساتھ غلط رہنمائی کا معاملہ کریں گے۔ چوں کہ غلط رہنمائی کا عمل وہ لوگ نہایت ہوشیاری کے انداز میں انجام دیں گے، اور عام انسان اس کی غلط رہنمائی کو صحیح رہنمائی سمجھ لیں گے، اس لیے ان کو حدیث میں دجال (The Great Deceiver) کہا گیا ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں امت میں ایسے فریبی لوگ پیدا ہوں گے جو غیر دینی باتوں کو دینی بنا کر پیش کریں گے۔ ان کی باتیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے سراسر غیر اسلامی ہوں گی مگر موضوع حدیثوں اور غلط تفسیروں کے ذریعے وہ ان کو اس طرح خوش نما بنائیں گے کہ لوگ ان کو عین اسلام سمجھ کر ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ امت کی تاریخ میں شاید سب سے بڑا فتنہ ہوگا۔ اسی لیے اس کو دجالی فتنہ سے تعبیر کیا گیا۔ دجال کا فتنہ آئڈیالوجی کا فتنہ ہے۔ جو لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہوں، ان کو دجالی فریب سے نکالنے کے لیے دوبارہ حجت یعنی عقلی استدلال کا طریقہ استعمال کرنا ہوگا۔

155

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے اور عربی میں اس کا ترجمہ کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تردید۔ تم یہ کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتارا گیا ہے۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7542)

تشریح: حدیث کی یہ بات عام مسلمانوں کی نسبت سے ہے۔ عام مسلمان جو علمی تجزیے اور تحقیق کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں ان کو اس طرح کے معاملے میں ایسا ہی رویہ اختیار کرنا چاہیے مگر جہاں تک اہل علم کا تعلق ہے وہ دینی مقاصد کے تحت قدیم صحیفوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

156

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جس بات کو سنے اس کو بیان کرنے لگے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 505)

تشریح: جھوٹ یہ ہے کہ آدمی ایک ایسی بات کہے جو واقعہ کے خلاف ہو۔ سنی ہوئی بات کا معاملہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہی ہے۔ سننا بذات خود کوئی درست ذریعۂ علم نہیں۔ کسی کے خلاف سنی ہوئی ایک بات اس وقت تک غیر معتبر ہے جب تک کہ وہ تحقیقی ذرائع سے ثابت نہ ہو جائے۔ ایسی حالت میں کسی کے خلاف ایک بری خبر کو سن کر اس کو بیان کرنا غیر مصدقہ بات کو دہرانا ہے۔ اور غیر مصدقہ بات اور خلاف واقعہ بات کے درمیان اپنی نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

اس حدیثِ رسول میں بات کے غیر مطلوب طریقے کو بیان کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بات کا مطلوب طریقہ کیا ہے۔ یہ مطلوب طریقہ قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کی سورہ الحجرات میں یہ اصول اس طرح بیان کیا گیا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (49:6)۔ یعنی، اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

قرآن کی اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ بات کو سننے کے بعد اس کو اسی طرح بیان نہ کیا جائے، بلکہ پہلے اس کی تبیین کی جائے۔ تبیین کا مطلب مکمل تحقیق (thoroughly inquiry) ہے۔ بات کو سن کر اسی طرح لوگوں سے بیان کرنا، جھوٹے آدمی کی پہچان ہے، اور بات کو سننے کے بعد، اس کی مکمل تحقیق کرنا، سچے آدمی کی پہچان ہے۔

عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ نے اس کی امت میں بھیجا تو اس کی امت میں سے کچھ لوگ اس کے حواری ہوئے۔ اور ایسے اصحاب ہوئے جو رسول کی سنت کو لیتے تھے اور ان کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ان کے ناخلف پیدا ہوئے، وہ ایسی بات کہتے تھے جس کو وہ خود نہ کرتے تھے۔ اور وہ ایسے کام کرتے تھے جس کا انھیں حکم نہیں ملا تھا۔ پس جو ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے۔ اور جو ایسے لوگوں کے ساتھ اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے۔ اور جو ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے۔ اور اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 50)

تشریح: اس حدیث میں ایک فطری قانون کا ذکر ہے جو ہر نبی کی امت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر نبی کی امت کی پہلی نسل ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو شعوری انقلاب کے تحت نبی کے ساتھی بنتے ہیں۔ مگر امت کی بعد کی نسلوں کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ لوگ شعوری انقلاب کے بغیر صرف پیدائشی تعلق کی بنا پر امت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بعد کے لوگوں میں وہ زندہ عقیدہ اور اعلیٰ کردار باقی نہیں رہتا جو امت کے ابتدائی لوگوں میں تھا۔

جب کوئی امت زوال کے اس دور میں پہنچ جائے تو اس وقت ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کو ازسرِ نو زندہ ایمان پر کھڑا کیا جائے۔ یہ اصلاحی کام امت کے ان افراد کو کرنا ہوتا ہے جو دین کا گہرا علم رکھتے ہوں۔ ان افراد پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ احیاء اور اصلاح کے اس عمل میں اپنی ساری طاقت لگائیں۔ اگر وہ عملی اعتبار سے یہ جدوجہد کر سکتے ہیں تو وہ عملی اعتبار سے اس کی کوشش کریں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ان پر فرض ہے کہ وہ زبان سے امر حق کا اعلان کریں۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو وہ امت کی اصلاح کے لیے تڑپیں اور اس کے لیے دعائیں کریں۔ اگر یہ تیسری چیز بھی نہ پائی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان کی آخری علامت بھی لوگوں میں باقی نہیں۔

ڈائری 1986

11 جون 1986

ہندوستان کے دو عالم پاکستان گئے تھے۔ وہاں وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ رہ کر واپس آئے ہیں۔ دہلی میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔

گفتگو کے دوران پاکستان کی سیاست کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ اخبارات بظاہر یہ تاثر دے رہے ہیں کہ پاکستان میں اگر آزادانہ الیکشن ہوا تو بھٹو پارٹی جیت جائے گی۔ انہوں نے فوراً اس کی تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ بے نظیر اور بھٹو پارٹی کی مقبولیت دیہاتوں تک محدود ہے۔ اگر الیکشن ہوا تو ممکن ہے وہ دیہاتوں میں جیت جائیں، مگر شہروں میں یہ لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

پاکستان سے واپس آنے والے صاحبان کا یہ تبصرہ بتاتا ہے کہ کسی ملک میں جانا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ آدمی وہاں کے حالات سے گہرائی کے ساتھ باخبر ہو جائے۔ مذکورہ دونوں عالم ایک ایسے ملک میں گئے جہاں مذہب کا فرق نہیں، جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے۔ وہ وہاں کے کسی بھی شخص سے اپنی مادری زبان میں بات کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ پاکستان کی سیاست سے بے خبر رہے۔

میں نے ان صاحبان کو بتایا کہ پاکستان کی آبادی کا 80 فیصد حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے اور 20 فیصد حصہ شہروں میں۔ اگرچہ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ بھٹو پارٹی شہروں میں کامیاب نہیں ہوگی، تاہم اگر آپ کے بقول وہ صرف وہاں کے دیہاتوں میں کامیاب ہو، تب بھی وہ پاکستان کی 80 فیصد سیٹ پر قبضہ کر لے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ملک کو جاننے کے لیے وہاں جانا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر تجزیاتی صلاحیت ہو۔ وہ مشاہدات سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکے۔

12 جون 1986

آج مالیگاؤں کے کئی آدمی ملنے کے لیے آئے۔ مالیگاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بیشتر لوگ پاورلوم کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہاں کا ہر آدمی کسی نہ کسی اعتبار سے پاورلوم کی انڈسٹری سے وابستہ ہے۔

گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ مالیگاؤں کی تجارت میں مسلمانوں کا کتنا حصہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ زیادہ تر تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد میں نے مزید سوالات شروع کیے تو معلوم ہوا کہ ان کا یہ جملہ واقعہ کے مطابق نہیں کہ مالیگاؤں کا زیادہ تر کاروبار مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مثلاً انہوں نے بتایا کہ سوت کی سپلائی کا کاروبار زیادہ تر ہندو کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح تیار شدہ کپڑوں کو مارکیٹ میں لانے کا کام بھی ہندو کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پاورلوم کاروبار کے دو سب سے بڑے حصے پر ہندو صاحبان کا قبضہ ہے۔ اولاً، ابتدائی مرحلہ میں سوت فراہم کرنا، ثانیاً، آخری مرحلہ میں تیار شدہ سامان کو بازار میں لانا۔ سوت کی سپلائی اور تیار شدہ مال کی مارکیٹنگ یہ دونوں آڑھت والے کام ہیں۔

پورے شہر میں ان کے صرف چند ڈیلر ہوتے ہیں۔ جب کہ دوسرے کاموں میں ہزاروں لوگ مشغول رہتے ہیں اور ہر گلی اور ہر سڑک پر اس کی سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے سمجھ لیا کہ مسلمان مالیگاؤں کے زیادہ تر تجارتی حصے پر قابض ہیں۔ حالانکہ جو لوگ بزنس کو سمجھتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ پاورلوم کی انڈسٹری میں زیادہ بڑا حصہ (lion's share) انہیں لوگوں کو ملتا ہے جو خام مال سپلائی کرتے ہوں اور تیار شدہ مال کی مارکیٹنگ کر رہے ہوں۔ آدمی کے اندر تجزیاتی ذہن نہ ہو تو وہ اپنے قدموں کے نیچے کے حالات سے ہمیشہ بے خبر رہے گا۔

13 جون 1986

مولانا امیر اللہ قاسمی (محبوب نگر) نے بتایا کہ محبوب نگر کے ایک صاحب بنگلہ دیش گئے۔ وہ تبلیغی جماعت کے ساتھ وہاں گئے تھے۔ بنگلہ دیش میں اقتصادی ابتری کا حال دیکھ کر انہوں نے وہاں کے ایک تعلیم یافتہ شخص سے پوچھا کہ بنگلہ دیش کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے۔ مذکورہ

شخص نے اس کا جواب دیا— سائیکلون۔

اس نے کہا کہ بنگلہ دیش میں جب سائیکلون آتا ہے تو ہم اس کی خبریں مبالغہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ اتنے آدمی مر گئے۔ اتنی بستیاں بہہ گئیں۔ اتنے مویشی ہلاک ہو گئے، وغیرہ وغیرہ۔ ان خبروں کے بعد بیرونی ملکوں کا جذبۂ ہمدردی بیدار ہوتا ہے اور وہ سامان اور رقم بھیجنا شروع کر دیتے ہیں۔ بس یہی ہے ہمارا ذریعۂ آمدنی۔

کیسی بری تھی تقسیم کی سیاست، جس نے برصغیر ہند میں رہنے والے مسلمانوں کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ انڈیا میں وہ کمزور اقلیت بن گئے۔ بنگلہ دیش میں وہ ایک غریب قوم بن گئے اور پاکستان میں وہ ایک ایسی قوم بن گئے جس کو کبھی سیاسی استحکام حاصل نہ ہوا۔

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان واحد سب سے بڑا مسلم گروہ ہوتے۔ منقسم ہندوستان میں وہ تین کمزور گروہ بن کر رہ گئے۔ یہ تھی مسلمانوں کے قائداعظم کی سیاست۔ اگر مسلمانوں نے کہیں قائداصغر پیدا کیا ہوتا تو ان کا کیا انجام ہوتا؟۔

14 جون 1986

نظام الدین میں ہمارے مکان کے پاس ایک دومنزلہ عمارت ہے۔ اس کے مالک ایک ہندو مسٹر اپل (Mr. Uppal) ہیں۔ وہ اردو جانتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہمارے یہاں کی چھپی ہوئی کتاب "اللہ اکبر" لے گئے تھے۔ آج کل وہ اس کو پڑھ رہے ہیں۔

مسٹر اپل کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے بڑی عجیب کتاب لکھی ہے۔ میں اس کو بہت غور سے پڑھ رہا ہوں اور مجھ کو اس میں بڑا آنند مل رہا ہے۔ اسی طرح نظام الدین کے ایک اور ہندو مسٹر آول نے اس کتاب کی غیر معمولی تعریف کی۔ بھوپال کے مسٹر پریم نراین گپتا کا خط آیا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ ہندی زبان میں شائع ہونا چاہیے۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے سامنے اسلام پیش کرنے کا وہ طریقہ اختیار کیا، جس کو مناظرہ بازی کہا جاتا ہے۔ یعنی ہندو دھرم کو کنڈم کر کے اسلام کو پیش کرنا۔

"اللہ اکبر" میں اسلام کی تعلیمات کو خالص فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ قاری کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ مناظرہ کے طریقہ سے ہندوؤں کو اسلام سے چڑھ ہوتی تھی۔ جب کہ "اللہ اکبر" والا طریقہ ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اسلام کے مثبت پیغام کو اس ملک کے ہندوؤں اور دوسری قوموں کے سامنے پیش کرسکیں۔

15 جون 1986

محمد اسلم صاحب ہوم منسٹری میں انڈر سکریٹری ہیں۔ آج کل وہ نمبر 44 پٹودی ہاؤس (نئی دہلی) میں رہتے ہیں۔ ان سے ان کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی بھی ساتھ تھے۔

جناب اسلم صاحب نے بعض علما کی تحریریں دکھائیں، جن میں حجاج بن یوسف کو بہت برا بھلا کہا گیا تھا۔ کیوں کہ اس نے منجنیق کے ذریعے کعبہ پر پتھر پھینکے۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ حجاج بن یوسف عبد الملک کی طرف سے حجاز کا گورنر تھا۔ اسی زمانے میں عبد اللہ بن زبیر نے عبد الملک کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور کعبہ کو مرکز بنا کر اپنی مخالفانہ تحریک چلانے لگے۔ اس وقت عبد اللہ بن زبیر کو زیر کرنے کے لیے حجاج بن یوسف نے جو کارروائیاں کیں انہیں میں سے ایک بیت اللہ پر پتھر پھینکنا ہے۔

یہ عمل اگر غلط ہے تو اتنا ہی غلط سعودی حکومت کا وہ عمل ہے جب کہ 1979 میں شاہ خالد کے زمانہ میں باغیوں کو مغلوب کرنے کے لیے بیت اللہ کے اندر گولیاں چلائی گئیں اور مسلح فوج اس کے اندر داخل ہوگئی۔

ہمارے علما حجاج بن یوسف کے خلاف پر جوش طور پر لکھتے اور بولتے ہیں، مگر مجھے موجودہ زمانہ کا کوئی ایک بھی قابل ذکر عالم معلوم نہیں ہے جس نے شاہ خالد کی اس قسم کی کارروائی کے خلاف کوئی مذمتی بیان دیا ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا دونوں عمل بالکل یکساں قسم کے عمل ہیں۔ اگر وہ غلط ہیں تو

دونوں کے لیے غلط ہیں اور اگر وہ درست ہیں تو دونوں کے لیے درست ہیں۔ موجودہ زمانہ کے علما عام طور پر اس قسم کے تضاد میں مبتلا ہیں۔ وہ ایک معاملہ میں ایک شخص کی مذمت کریں گے اور ٹھیک اسی قسم کے معاملہ میں دوسرے کے بارے میں خاموش رہیں گے۔ میرا ذاتی مسلک یہ ہے کہ میں ایک کے معاملہ میں بھی خاموش رہتا ہوں اور دوسرے کے معاملہ میں بھی۔

16 جون 1986

ہندوستان ٹائمس (16 جون 1986) کے آخری صفحہ پر ایک خبر ہے۔ اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیل کی راجدھانی تل ابیب میں وہاں کی ریلیجس مائنارٹی اور سیکولر میجورٹی کے درمیان ایک نئی نزاع کھڑی ہوگئی ہے۔ یہودیوں کا مذہبی طبقہ اس کے خلاف سخت احتجاج کر رہا ہے کہ عورتوں کی نیم عریاں تصویریں اشتہارات میں استعمال کی جائیں۔ تل ابیب میں ایسے بہت سے اشتہارات پر سیاہی پھیری گئی یا ان کے بورڈ جلائے گئے جن میں عورتوں کو نہانے کے لباس میں دکھایا گیا تھا۔ اخبار کی رپورٹ کا ایک پیراگراف یہ ہے:

"We do not believe in violence, but the secular people have declared war on us. We will return war for war, a war to end all wars. Rabbi Avraham Salomon, a leader of the ultraorthodox sect Eda Haredit, told the Associated Press in an interview."

ہم تشدد میں یقین نہیں رکھتے۔ مگر سیکولر لوگوں نے ہمارے خلاف ایک جنگ چھیڑ دی ہے۔ ہم جنگ کا جواب جنگ سے دیں گے۔ ایک جنگ جو تمام جنگوں کو ختم کرنے کے لیے ہوگی۔ یہ بات یہودیوں کے ایک کٹر مذہبی لیڈر نے کہی۔

یہ واقعہ جو اسرائیل میں ہوا، اسی قسم کے واقعات مختلف اسلامی ملکوں میں بھی ہو چکے ہیں اور خود ہندوستان میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کو کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو اسلامی نظام کا علمبردار کہتے ہیں۔ اگر عریاں اشتہارات پر سیاہی پھیرنا یا ان کو جلانا پھونکنا کوئی دینی فعل ہے تو عین یہی فعل یہودیوں کا مذہبی طبقہ بھی اسرائیل میں کر رہا ہے۔ کیا نام نہاد اسلام پسند طبقہ اس معاملہ میں یہودیوں کو بھی وہی کریڈٹ دینا پسند کرے گا جس کو اس نے اپنے مفاخر کی فہرست میں درج کر رکھا ہے۔

ایک انٹرویو

(زیرنظر انٹرویو مولانا وحیدالدین خاں صاحب سے ستمبر 1991 میں "زندگی" لاہور کے نمائندہ اصغر عبداللہ نے لیا تھا۔ ماہنامہ تذکیر لاہور کے شکریہ کے ساتھ یہاں شائع کیا جارہا ہے)

سوال: مولانا قارئین "زندگی" کو اپنے سفر زندگی کا احوال سنائیں۔

جواب: میں 1925 میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوا۔ ہمارا گھرانہ مذہبی گھرانہ تھا۔ ابتدائی تعلیم ایک دینی مدرسے میں حاصل کی۔ وہاں سے فراغت کے بعد تلاش حق کا جذبہ پیدا ہوا۔ میں نے یکسوئی سے مطالعہ شروع کر دیا۔ جس سے اسلام پر ازسرنو میرا یقین بحال ہوا۔ یہ یقین مدرسے میں حاصل نہ ہوا تھا۔ مطالعے کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ اسلام کو عصر حاضر میں علم جدید کا چیلنج درپیش ہے اور دور حاضر میں جسے دعوت اسلام کا کام کرنا ہے، اس کے لیے علم جدید پر عبور حاصل کرنا لازم ہے۔ مدرسے میں، میں نے عربی زبان پڑھی تھی۔ اب انگریزی زبان سیکھنے کا شوق ہوا۔ قریب قریب 20 سال میرے اوپر ایسے گزرے کہ میں نے انگریزی کے سوا کچھ نہ پڑھا۔ انگریزی میں ہی غرق رہا۔ اس طرح جدید علوم تک میری رسائی ہوئی۔ "اسلام اور عصر حاضر" میرا خصوصی موضوع بن گیا۔

سوال: اس کے علاوہ آپ نے کن کن موضوعات کو مطالعے کا ہدف بنایا؟

جواب: جو کچھ ملا، پڑھ لیا۔ کسی ایک مضمون پر توجہ مرکوز نہیں کی۔ مثلاً میں نے یہ طے کیا کہ انگریزی اخبار ہی پڑھوں گا۔ ابتدا میں کچھ سمجھ میں آتا، کچھ نہ آتا۔ لیکن پھر رواں ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے لائبریریوں کا رخ کیا اور ان کو کھنگال ڈالا۔ کئی ایسی لائبریریاں بھی تھیں کہ کتابوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ شاید میں نے ہی ان کو پہلی مرتبہ کھول کر پڑھا۔ فلسفہ، سائنس، معاشرت، معیشت جس موضوع پر جو کچھ ملا، پڑھ ڈالا۔

سوال: آپ نے دینی تعلیم کے علاوہ دوسری تعلیم کہاں حاصل کی؟

جواب: دینی تعلیم ہی میں نے باقاعدہ حاصل کی، اس کے علاوہ ذاتی مطالعہ کیا۔

سوال: جماعت اسلامی سے وابستگی کب اختیار کی؟

جواب: نوجوانی میں ہی جماعت اسلامی سے قربت پیدا ہوئی۔ بعد ازاں میں نے جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ تقریباً پندرہ برس اس جماعت سے وابستہ رہا۔ 1957 کے لگ بھگ مجھے جماعت اسلامی سے فکری اختلاف پیدا ہوا۔ میں نے مطالعہ جاری رکھا، جماعت اسلامی کے ذمہ دار اصحاب سے باتیں کیں، اصحاب علم سے خط و کتابت کی۔ رفتہ رفتہ مجھ پر جماعت اسلامی کے فکر کی غلطی واضح ہوتی گئی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اب مجھے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے۔ جماعت اسلامی کے ذمہ داران کا اصرار تھا کہ میں جماعت اسلامی سے تعلق منقطع نہ کروں۔ کوئی راضی نہ تھا کہ میں جماعت اسلامی چھوڑ دوں۔ لیکن میرے لیے ایسا ممکن نہ تھا۔

سوال: ایسا کیوں ممکن نہ ہوا؟

جواب: اس لیے کہ میری دیانت دارانہ رائے یہ تھی کہ جماعت اسلامی مولانا مودودی مرحوم کے فکر کی بنیاد پر اٹھی ہے اور تاریخی اسباب نے ان کے لٹریچر کو یہ حیثیت دے دی کہ اب وہی ارکان جماعت کی نظر میں جماعت اسلامی کے فکر کی مستند شرح ہے۔ ایسی حالت میں ایک شخص اگر جماعت اسلامی کے اندر رہتے ہوئے دین کی ایسی تشریح کو پھیلانے کی کوشش کرتا ہے جو مولانا کے لٹریچر کے مطابق نہیں تو یہ دیانت کے خلاف ہے۔ جماعت اسلامی کا پلیٹ فارم ان کے اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے ہے، کسی دوسرے کے نظریات کی تبلیغ کے لیے نہیں۔

سوال: لیکن جماعت اسلامی کے ذمہ داران نے تو آپ کو اجازت دے دی تھی کہ آپ اپنے اختلافات پر قائم رہتے ہوئے جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم پر کام کر سکتے ہیں؟

جواب: جماعت اسلامی کے اندر رہ کر کام کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ جماعت مولانا مودودی کے لٹریچر کے بارے میں یہ طے کر دیتی کہ وہ جماعت اسلامی کے فکر کی مستند شرح نہیں، میں نے امیر جماعت اسلامی ہند کو یہ تجویز پیش بھی کی، جو ان کو قبول نہ تھی۔ ظاہر ہے، اس کے بعد میرے لیے ایک ہی راہ باقی رہ گئی کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کو کہنے کے لیے جماعت

اسلامی کے دائرے سے باہر نکل آؤں۔ سو میں نے یہ کیا اور میں اپنے اس فیصلے پر مطمئن ہوں۔

سوال: جماعت اسلامی کے فکر سے آپ کو بنیادی اختلاف کیا تھا؟

جواب: دیکھیے، مولانا مودودی مرحوم کی غلطی عام غلطیوں سے مختلف ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ دین، عقیدہ اور عمل کے جس مجموعہ کا نام ہے، اس میں کمی بیشی کی ہو۔ وہ سارے دین کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس مجموعہ کے مختلف اجزا کی واقعی حیثیت ان کی تشریح میں بدل گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان سے متاثر اذہان بظاہر سب کچھ مانتے ہیں، لیکن سب کچھ کو وہ اس طرح نہیں مانتے جس طرح کہ انہیں ماننا چاہیے۔

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز خدا سے تعلق پیدا کرنا اور آخرت کے عذاب سے ڈرنا ہے۔ اس کو ہمیں اپنانا ہے اور اسی کی طرف ہمیں اہل دنیا کو بلانا ہے۔ لیکن اس فکر نے آخرت اور تعلق باللہ کے پہلو کو محض تربیت کی ضرورت بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی تشریح کے خانے میں یہ چیزیں ایسی حیثیت اختیار کی گئی ہیں۔ گویا یہ کارکن تیار کرنے کی تربیت گاہیں ہیں، نہ کہ یہی وہ اصل بات ہے جس کے لیے ہمیں متحرک ہونا ہے۔ مولانا مودودی مرحوم کے خیال میں اصل مسئلہ دنیا میں انقلاب برپا کرنے کا ہے۔ آخرت کا خوف اور اس طرح کی دوسری چیزیں اس لیے ہیں تاکہ جو لوگ انقلاب عالم کا یہ پروگرام لے کر اٹھیں یا انقلاب کے بعد نظام دنیا کو سنبھالیں ان میں مقصد کی لگن اور کردار پیدا ہو۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جماعت اسلامی کے لوگ آخرت کی کامیابی کے بجائے دنیا میں کامیاب ہونے کو اپنا حقیقی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا حقیقی مقصد تو بلاشبہ آخرت ہی کی کامیابی ہے، لیکن آخرت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دنیا میں کیا کرنا ہے، اس کے متعلق ان کا تصور غلط ہو گیا ہے۔ ایک شخص اگر یہ نظریہ قائم کر لے کہ دنیا کی مادی قوتوں کی تسخیر آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے اور یہ سوچ کر وہ اس کے لیے کام کرنا شروع کر دے تو اس کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ اصل مقصد کی حیثیت سے تو بے شک اس نے آخرت میں خدا کی رضا ہی کو سامنے رکھا ہے مگر اس رضا کو حاصل کرنے کی صورت کیا ہو؟ دوسرے لفظوں میں دنیا میں ہم کیا پانے کی کوشش کریں، تاکہ

آخرت میں ہم خدا کو پاسکیں؟ اس کے متعلق جماعت اسلامی کا تصور بدل گیا ہے۔

اس تشریح کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلق باللہ اور آخرت وغیرہ کی باتیں اگرچہ جماعت اسلامی کے پروگرام میں شامل ہیں، لیکن اس کے افراد میں وہ اپنا حقیقی مقام حاصل نہ کرسکیں۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ میں خوف خدا اور فکر آخرت کے حوالے سے جو بات کرتا ہوں اس کو اس تعبیر سے متاثر ذہن رد نہیں کرتا۔ وہ اس کو دلچسپی سے پڑھتا اور سنتا ہے، لیکن لٹریچر نے اس کا جو ذہنی سانچہ بنا دیا ہے اس کی وجہ سے اس قسم کی باتیں اس کے اندر صحیح شکل میں نہیں بیٹھتیں۔ وہ بس تربیت کے خانے میں چلی جاتی ہیں۔ اب چونکہ دین اور فطرت میں کامل مطابقت ہے، اس لیے اگر فطرت میں ذرا سی کجی آجائے تو دین اس کے اندر ٹھیک ٹھیک بیٹھ نہیں سکتا۔ لہٰذا سننے اور پڑھنے کے باوجود اس طرح کی باتوں کا واقعی اثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے فیصلہ کرنا پڑا کہ محض مثبت طور پر اپنی بات کہتے رہنا بے سود ہے۔ اب ضروری ہے کہ سابقہ تعبیر پر براہ راست تنقید کرکے پہلے اس کا غلط ہونا ثابت کیا جائے۔ سو میں نے یہ کیا۔

سوال: آپ نے اس مسئلے پر مولانا مودودی مرحوم سے خط و کتابت بھی کی تھی؟

جواب: دسمبر 1961 میں، میں نے اپنی تحریر کی ایک نقل تیار کرکے ان کے نام روانہ کی۔ لیکن یہ ان تک پہنچ نہ سکی۔ اس کے بعد میں نے پھر ایک نقل 10 مئی 1962 کو دستی طور پر لاہور روانہ کی اور یہ درخواست کی کہ وہ اس کا جواب مرحمت فرمائیں۔ لیکن انہوں نے جواب نہ دیا۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح کا رویہ شاید انہوں نے میرے ساتھ ہی اختیار کیا، ورنہ بالعموم وہ ہر ایک کو جواب دے دیا کرتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ میرا جواب نہ دیا بلکہ طرح طرح کے فقرے بھی مجھ پر کستے رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے لکھا کہ آپ اپنی تحریر کے ہر صفحہ کے ساتھ ایک خالی صفحہ منسلک کر دیں۔ میں نے ایسا کر دیا۔ لیکن جواب ندارد۔ البتہ ایک کاغذ پر انہوں نے کچھ لکھا ہوا تھا، لیکن پھر اس کو مٹا ڈالا گیا تھا۔ اب چونکہ یہاں ان کی نیت کا مسئلہ آجاتا ہے اور میرا طریقہ یہ ہے کہ میں نیت پر بات نہیں کرتا کہ نیت کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ میرے لیے ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ میں نے اپنے

ساتھیوں سے کہا کہ مجھے بہت خوشی ہوتی اگر مولانا مودودی میرا ذہن بدل دیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مولانا مودودی نے اگر میری تحریر کا جواب نہ دیا صرف اتنا ہی کر دیا کہ تحریر کے کسی ایک حصہ کو لے کر اسے غلط ثابت کر دیا تو اس سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ میں متزلزل ہو جاؤں گا۔ لیکن افسوس کہ میری یہ امید بھی پوری نہ ہوئی۔ بہر حال میرا خیال ہے کہ مولانا مودودی نے ایک مخدوش راہ کا انتخاب کیا۔ یہ ان کی اخلاقی اور دینی ذمہ داری تھی کہ وہ میرے اٹھائے گئے نکات کا جواب دیتے۔

سوال: مولانا مودودی مرحوم سے کبھی آپ کی براہ راست ملاقات ہوئی؟

جواب: میری ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ شاید 1971 کے لگ بھگ کی بات ہے۔ دونوں ملاقاتیں مولانا کے گھر 5 اے ذیلدار پارک میں ہوئیں۔ ایک ملاقات عصر اور مغرب کے درمیان ہوئی۔ دوسری ملاقات تنہائی میں ہوئی، جس میں طویل بات چیت بھی ہوئی۔

سوال: کن موضوعات پر گفتگو ہوئی؟ "تعبیر کی غلطی" پر بھی تبادلہ خیال ہوا؟

جواب: یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب اس طرح کی ملاقات سے کسی کو کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس کو رہنے ہی دیجئے۔

سوال: مولانا ابوالکلام آزاد نے حزب اللہ قائم کی، مولانا مودودی مرحوم نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی اور اب ڈاکٹر اسرار احمد تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے اسلامی انقلاب کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ لیکن نہ صرف یہ کہ اس طرح کی جماعتوں کے معاشرے پر کوئی قابل ذکر اثرات نظر نہیں آتے، بلکہ ان تحریکوں نے جو اہداف (target) مقرر کیے بظاہر وہ بھی حاصل نہیں ہو سکے۔ آپ کے خیال میں اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

جواب: اس کی وجہ بڑی واضح ہے۔ اگر آپ کو گھر بنانا ہے تو پہلے ہی مرحلہ پر آپ اس کی چھت نہیں اٹھا سکتے۔ اگر ایسا کریں گے تو قیامت تک گھر نہیں بن سکے گا۔ پہلے آپ کو اس کی بنیاد رکھنی ہوگی، پھر ستون تعمیر ہوں گے، پھر اس کے بعد چھت ڈالی جائے گی۔ اخباروں میں ایک اصطلاح ہے الٹا اہرام (Inverted Pyramid)۔ مطلب یہ کہ ایک شخص نے مال روڈ (لاہور) پر گولی سے ایک شخص کو ہلاک کر دیا۔ خبر یہ ہوگی کہ ایک آدمی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ اب یہ واقعہ کی آخری

صورت ہے، لیکن قبل ازیں گولی مارنے والے آدمی نے منصوبہ بنایا، بندوق حاصل کی، گولی حاصل کی، موٹر سائیکل حاصل کی۔ تو اس طرح یہ پورا ایک قصہ ہے۔ اب اخبار میں تو اتنی سی خبر آجاتی ہے کہ ایک آدمی گولی سے ہلاک ہوگیا۔ اخبار کے صفحہ پر تو الٹا اہرام بن سکتا ہے، لیکن زندگی میں نہیں بن سکتا۔ جن لوگوں کا آپ نے ذکر کیا انہوں نے زندگی میں الٹا اہرام بنانے کی کوشش کی۔

اسی طرح پاکستان میں یہ کہا جاتا ہے کہ بھارتی کلچر ہم پر حملہ آور ہے اور یہ کہ ہمیں اس کو روکنا ہے، لیکن کیا وہ رک گیا۔ بھارتی فلمیں آپ کے گھر گھر میں دیکھی جارہی ہیں۔ حکومت کا اختیار ناکام ہوگیا ہے۔ ایسا کیوں ہورہا ہے؟ اس لیے کہ معاشرہ اور فرد تیار نہیں۔ مولانا آزاد سے لے کر ڈاکٹر اسرار تک کوئی ایک تحریک بھی ایسی نہیں جس نے حقیقی معنوں میں "تعمیر فرد" کا کام کیا ہو، اور ان الٹے کاموں کو چھوڑ دیا ہو جو تعمیر فرد کے کام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ مثلاً آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بیٹا ڈاکٹر بنے، لیکن آپ اس سے دادا گیری بھی کروا رہے ہیں، تو ایسا ہو نہیں سکتا کہ وہ دادا گیری بھی کرے اور ڈاکٹر بھی بنے۔ ڈاکٹر بننے کے لیے دادا گیری ترک کرنی پڑے گی۔ میرے خیال میں ان تحریکوں کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ان تحریکوں نے اس کام کو اپنا ہدف قرار دے دیا جو دین کا ہدف نہیں، اس طرح ان کی تمام جدوجہد 'عملاً' بے ہدف ہوکر رہ گئی۔ اس تیر نیم کش کی طرح جس کا کوئی ہدف نہ ہو۔ (جاری)

ہر والدین کو فطری طور پر اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت ہوتی ہے۔ اس محبت کا بہترین استعمال یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کو آداب زندگی سکھائیں۔ وہ اپنے بچوں کو بہتر انسان بنا کر دنیا کے کارزار میں داخل کریں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ والدین اپنی محبت کا استعمال زیادہ تر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ بچہ جو چاہے وہ اس کے لیے حاضر کر دیا جائے، یہی بچہ کے لیے محبت کا سب سے زیادہ بڑا استعمال ہے، مگر یہ بچوں کے حق میں خیر خواہی نہیں۔ ان کے حق میں خیر خواہی یہ ہے کہ بچہ جب بالکل چھوٹا ہو اسی وقت سے اس کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے تاکہ یہ چیزیں عادت بن کر اس کی زندگی میں داخل ہو جائیں۔ اس تعلیم و تربیت کے تین خاص پہلو ہیں: دین، اخلاق اور ڈسپلن۔

سوال وجواب

سوال

قرآن میں یہ دعا آئی ہے: رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (10:85)۔ یعنی، اے ہمارے رب، ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا۔ اسی طرح سورہ الممتحنہ میں ہے: رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا (60:5)۔ یعنی، اے ہمارے رب، ہم کو منکروں کے لیے فتنہ نہ بنا۔

ان دونوں آیتوں میں "ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنا" کا مطلب کیا ہے۔

جواب

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے ذریعے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ کسی بھی اعتبار سے غیر اہل حق کو فتنہ اٹھانے کا موقع نہ دیں۔ ایک مفسر نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: لا تجعلنا سببا لزيادة طغيانهم (تفسیر مظہری، جلد 5، صفحہ 50)۔ یعنی اے رب ہم کو سبب نہ بنا ان کی سرکشی میں اضافہ کا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسا غلط اقدام نہ کریں، جس سے کسی کو یہ جواز (justification) ملے کہ وہ ہمارے اوپر ظلم کرے، وہ ہم کو دین پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے سے روکے۔

اصل یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عالمی حالات میں ایک نیا تاریخی عمل (historical process) شروع ہوا، جو اس حد تک پہنچا کہ اللہ کے دین کو عمومی اعتراف (general acceptance) کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اب اپنے اور غیر (we and they) کا فرق مٹ گیا ہے۔ موجودہ دور میں کچھ لوگ اگر مومنین ہیں تو بقیہ لوگ مؤیدین (supporters) ہیں۔ اس طرح اہلِ ایمان کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ کسی بھی قسم کی حقیقی رکاوٹ کے بغیر اللہ کے دین پر عمل کریں، اور اس کو سارے عالم میں پہنچائیں۔

اب دنیا کامل مذہبی آزادی کے دور میں ہے۔ اب اسلام کی دعوت کے لیے دوسری قوموں کی طرف سے کوئی حقیقی رکاوٹ نہیں۔ موجودہ زمانے میں اگر کوئی شخص یا گروہ حقیقی معنوں میں پر امن

طریق کار کو اختیار کرتے ہوئے اپنے دین پر عمل کرتا ہے، اور اس کو دوسروں تک حکمت کے ساتھ پہنچاتا ہے تو اس کو ہرگز کسی سے کسی قسم کے جبر یا تشدد کا سامنا پیش نہیں آئے گا۔ اب اگر رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے تو صرف اس وقت جب کہ مسلمان خود اپنے کسی غیر حکیمانہ عمل کی بنا پر لوگوں کو غیر ضروری طور پر اپنا مخالف بنالیں۔ وہ "آبیل مجھے مار" کا طریقہ اختیار کرکے دوسروں کے اندر ایسا ردعمل (reaction) پیدا کریں کہ جو ان کے لیے عملاً موافق اقوام بنے ہوئے ہیں، وہ غیر ضروری طور پر ان کے مخالف بن جائیں۔

سوال

عذاب قبر کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ القَبْرَ أَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الآخِرَةِ، فَإِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَيْسَرُ مِنْهُ، وَإِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَشَدُّ مِنْهُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2308)۔ یعنی قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے۔ اگر کوئی اس سے نجات پا گیا تو اس کے بعد کا راستہ آسان تر ہے، اور جو کوئی اس میں بچ نہ سکا، تو اس کے لیے بعد کا راستہ سخت مشکل ہے۔

قبر دوسری زندگی کا دروازہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی شخص کے لیے اس دروازہ کو کھلتے ہوئے اور پھر اس کے اوپر بند ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ خود ان کے لیے بھی یہ دروازہ کھولا جائے گا، اور پھر اسی طرح بند ہوگا، جس طرح وہ دوسروں کے اوپر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔

اس معاملے میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ قبر میں کس طرح کی پکڑ ہوگی یا کس طرح کا انعام دیا جائے گا۔ عذاب خواہ کم ہو یا زیادہ، عذاب انسان کے لیے تکلیف ہی ہے۔ اس لیے اصل فکرمندی کی بات یہ ہے کہ ایک انسان یہ سوچے کہ اس نے قبر کے لیے کیسی تیاری کی ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے اس

کو قیامت کا وقت بتانے کے بجائے یہ پوچھا تھا کہ تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے: وَمَاذَا أَعْدَدْتَ لَهَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3688)۔ یہی سوال یہاں بھی انسان کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ وہ اگر قبر یا قیامت کے تعلق سے فکرمند ہے تو اس نے وہاں کی گرفت سے بچنے کے لیے کیا منصوبہ بندی کی ہے۔

حقیقت پسندی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ایک ہدایت ان الفاظ میں دی تھی: میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو (لَا تُطْرُونِي)، جیسا کہ نصاریٰ نے ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا۔ میں تو صرف اللہ کا ایک بندہ ہوں، تم صرف یہ کہو کہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3445)۔

اس ہدایت پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد امت کو ایک عظیم خطرہ سے بچانا تھا۔ اور وہ ہے غیر حقیقت پسندانہ مزاج۔ پیغمبر کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہ ایک بشر تھے۔ اور مزید بات یہ تھی کہ اللہ نے ان پر وحی نازل کی (18:110)۔ لیکن جب امت اطراء (مبالغہ آمیزی) کا معاملہ کرے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امت کے اندر غیر حقیقت پسندانہ مزاج پرورش پاتا ہے، یعنی امانی (wishful thinking) کا مزاج۔ مبنی بر حقیقت پلاننگ کا مزاج ان کے اندر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ مزاج اس طرح آتا ہے کہ لوگ پہلے اپنے پیغمبر کو شہنشاہ کونین اور فخر موجودات جیسے مبالغہ آمیز القاب دیتے ہیں۔ پھر یہ مزاج عام ہو کر دوسرے مفروضہ بڑوں کے لیے بولا جانے لگتا ہے۔ مثلاً امام، اکابر، شیخ العالم، قائم الزماں اور سید الملت، وغیرہ۔ مگر یہ سب غیر حقیقت پسندی یعنی قصیدہ خوانی کی زبان ہے۔ اور قصیدہ خوانی کا مزاج ہمیشہ لوگوں کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) کا عمل روک دیتا ہے۔ لوگ اجتہاد کے بجائے فکری جمود (intellectual stagnation) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے پیغمبرِ اسلام نے اس مزاج سے اپنی امت کو شدت کے ساتھ روکا ہے۔

विविधता का उसूल

जिस दुनिया में हम रह रहे हैं उसकी व्यवस्था विविधता और रंग-बिरंगेपन के नियम पर क़ायम है। यही विविधता इंसानों के बीच भी अपेक्षित है। हमें इंसानों के बीच यह मिज़ाज बनाना चाहिए कि वह अनेकता और भिन्नता के बावजूद एक होकर रहें। वह हर तरह के इंसानों के बीच ज़िंदगी गुजारना सीखें। इंसानी एकता को क़ायम करने के लिए फ़र्क़ व विविधता को मिटाना प्रकृति के नियम के विरुद्ध है इसलिए यह विचार कभी सफल नहीं हो सकता।

मिसाल के तौर पर जानवरों को लीजिए। जानवरों की दस लाख से ज़्यादा किस्में पाई जाती हैं और हरेक का एक काम है, जो उसी के लिए नियत है। यहां जमीन पर रहने वाले कीड़ों की भी ज़रूरत है, जो गन्दी और बेकार चीज़ों को विखंडित (decompose) करके हमारे वातावरण को लगातार पाक साफ करते रहते हैं। यहां बैल की भी ज़रूरत है, जो हमारे खेत जोते और घोड़े की भी जरूरत है जो हमारी सवारी के काम आए। एक तरफ़ अगर यहां चिड़ियों की भी ज़रूरत है, जो चहचहाएं तो दूसरी तरफ़ गधे की भी जरूरत है कि जब वह चीखे तो आप सोचें कि मुझे इस तरह चीख कर नहीं बोलना चाहिए।

यही मामला तमाम दूसरी चीजों का भी है। इस दुनिया में बेहिसाब विविधता है और रंगबिरंगापन है, इसी विविधता और अनेकरूपता पर उसकी व्यवस्था चल रही है। इसी पैटर्न पर इंसानों को पैदा करने वाले ने इंसानों के भीतर भी भिन्नता और विविधता रखी है। इस विविधता को बाकी रखने ही में इंसान की तरक़्क़ी और कामयाबी है। इस विविधता को मिटाना ऐसा ही है जैसे इंसानों को बराबर क़द का बनाने के लिए लोगों को नीचे और ऊपर से तराश कर बराबर किया जाने लगे।

अनेकता में एकता

क़ायनात का अध्ययन करने से मालूम होता है कि इसमें अनेकता में एकता का नियम लागू है। यानी चीज़ें देखने में तो भिन्न और अनेक हैं। पर जब उनका विश्लेषण किया जाता है तो मालूम होता है कि तमाम चीज़ें अपनी अंतिम सच्चाई की दृष्टि से परमाणु (एटम) का संकलन हैं। हर चीज़ अंततः एटम है, चाहे वह ऊपर से कुछ भी दिखाई देती हो।

यही क़ायनाती पैटर्न इन्सानों के अन्दर भी रखा गया है। इन्सान ऊपर से देखने में एक-दूसरे से अलग नज़र आते हैं। उनमें रंग और नस्ल के लिहाज़ से बहुत सी भिन्नताएं पाई जाती हैं, पर अगर उनका ऐतिहासिक विश्लेषण किया जाए तो पता चलता है कि तमाम नस्लें आख़िरकार एक मां-बाप पर जाकर ख़त्म होती हैं। यानी सब एक-दूसरे के भाई हैं, न कि एक-दूसरे के पराए।

यही बात क़ुरआन में इन शब्दों में कही गई है: ऐ लोगो, अपने रब से डरो, जिसने तुमको एक जान से पैदा किया, और उससे उसका जोड़ा निकाला। और फिर उन दोनों से बहुत से मर्द और औरत ज़मीन में फैला दिए। (4:1)

यही बात हदीस में इस तरह आई है: सुन लो कि तुम सब आदम की औलाद हो और आदम मिट्टी से थे। (मुसनद अहमद, हदीस संख्या 8736)

इन्सानी एकता की यह परिकल्पना हर इन्सान के दिल में दूसरे इन्सान के लिए मुहब्बत और सदभाव पैदा करती है। वह पूरी इन्सानी नस्ल को एक कुटुम्ब, एक ख़ानदान और एक बिरादरी बना देती है। हदीस में कहा गया है:

> "तमाम मखलूक (जीवधारी) अल्लाह की कुटुम्ब है। तमाम लोगों में अल्लाह के निकट सबसे ज़्यादा प्रिय वह है, जो अपने कुटुम्ब के साथ अच्छा सलूक करे।" (मुसनद अल-बज़्ज़ार, हदीस संख्या 6947)

क़ायनाती मॉडल अनेकता में एकता की खूबी रखता है। इन्सान को भी इसी क़ायनाती माडल पर अपनी जिंदगी का नक़्शा बनाना चाहिए। उसको अनेक में एक नमूना बन जाना चाहिए। क़ायनात में जब अनेकता में एकता (unity in diversity) का नियम चल रहा है तो इन्सान के लिए यह दुरुस्त नहीं कि वह अनेक को एक करने (unification of diversity) के तरीके पर जिंदगी की व्यवस्था बनाने की कोशिश करे।

तरक़्क़ी और एकता

आजकल जो चीज़ सबसे ज़्यादा बहस का विषय बनी हुई है वह राष्ट्रीय एकता (national integration) है। व्यापक अर्थों में इसको मानवीय एकता कहा जाता है। इसमें शक नहीं कि यह एकता आज हमारी सबसे बड़ी ज़रूरत है। इसी पर देश की तरक़्क़ी और कामयाबी निर्भर है। पर इस मामले में बोलने वाले जो कुछ बोल रहे हैं या लिखने वाले जो कुछ लिख रहे हैं, उसको देख कर मुझे ऐसा लगता है कि इस बारे में लोगों का ज़ेहन साफ़ नहीं है कि वे जो कुछ चाहते हैं उसको हासिल करने का तरीक़ा क्या है।

ज़्यादातर लोगों की तरफ़ से यह कहा जा रहा है कि नेशनल इंटेग्रैशन का रास्ता कलचरल इंटेग्रैशन से है। यानी लोगों में एकता पैदा करने का तरीक़ा यह है कि उनका कल्चर (संस्कृति) एक कर दिया जाए। भाषा, धार्मिक रीति रिवाज, पहनावा, त्यौहार, शादी-ब्याह, इस तरह की तमाम सांस्कृतिक चीज़ों को सबके लिए समान (कामन) और साझा बना दिया जाए। इस तरह लोगों में वह एकता या इंटेग्रैशन पैदा हो जायगा, जिसकी हमें जरूरत है।

लेकिन इस विचार को मैं ऐसा ही समझता हूं जैसे किसी देश में तमाम नागरिकों के बीच एकता और सहमति पैदा करने के लिए यह प्रस्ताव रखा जाए कि प्लास्टिक सर्जरी के ज़रिए तमाम इन्सानों को एक जैसी शक्ल का बना दिया

जाए। जिस तरह एक ही तरह की प्लास्टिक सर्जरी के ज़रिए अलग-अलग किस्म के लोगों में एकता पैदा नहीं की जा सकती, उसी तरह ऊपर बयान की गई तरकीबों से राष्ट्रीय एकता या नेशनल इंटेग्रैशन भी पैदा नहीं किया जा सकता।

सच्चाई यह है कि राष्ट्रीय एकता का रहस्य एक कलचर में नहीं है, बल्कि एक ज़ेहन में है। इस उद्देश्य के लिए हमें लोगों के अन्दर इसके अनुकूल सोच पैदा करनी होगी। प्लास्टिक सर्जरी जैसा कोई उपाय ऊपरी शक्ल को तो बदल सकता है, पर वह अन्दरूनी सोच को नहीं बदल सकता। और महज़ ऊपरी चीज़ों को एक कर देने से कभी सच्ची एकता पैदा नहीं हो सकती।

अख़्लाक़ी ज़हर

6 जनवरी, 1990 को दिल्ली (शकूरपुर) में एक दर्दनाक हादसा हुआ। कुछ छोटे बच्चे एक मैदान में खेल रहे थे। वहां एक तरफ़ कूड़े का ढेर था। वे खेलते हुए उस कूड़े तक पहुंच गए। यहां उन्हें एक पड़ी हुई चीज़ मिली। यह कोई ज़हरीली चीज़ थी। मगर उन्होंने उसको बेख़बरी में उठा कर खा लिया। इसके नतीजे में दो बच्चे फ़ौरन ही मर गए, और आठ बच्चों को गम्भीर हालत में जयप्रकाश नारायण अस्पताल में दाख़िल करना पड़ा। ये बच्चे दो साल से पांच साल तक के थे।

टाइम्स ऑफ इंडिया (7 जनवरी 1990) ने पहले पेज पर इसकी ख़बर देते हुए लिखा है कि इन बच्चों में से एक ने वहां एक छोटा पैकेट पाया। ~~देखे~~ उसमें करीब डेढ़ सौ ग्राम कोई सफ़ेद रंग का चूर्ण था। उन्होंने ग़लती से उसको शक्कर समझा और आपस में बांट कर खाने लगे। खाने के चन्द मिनट बाद उनके होंठ नीले पड़ गए:

> One of them found a small packet containing about 150 gm of white, powdery substance. They mistook it for sugar and distributed it among themselves, within minutes of consuming it, their lips turned blue.

भौतिक ख़ुराक के लिहाज़ से यह चन्द बच्चों का वाकिआ है, लेकिन नैतिक ख़ुराक की दृष्टि से देखिए तो आज यही तमाम इन्सानों का वाक़िआ है। आज की दुनिया में तामाम इन्सान ऐसी नैतिक ख़ुराकें खा रहे हैं जो उनकी इन्सानियत के लिए ज़हर हैं, जो उनको हमेशा की बरबादी से दो-चार करने वाली हैं।

झूठ, दुराचार, रिश्वत, अहंकार, ईर्ष्या, ज़ुल्म, अपहरण, अवैध क़ब्ज़ा, बद्दियानती, वादाख़िलाफ़ी, बदख़्वाही, बेउसूली, बद-मामलगी, अविश्वास, ग़लती न मानना, एहसानफ़रामोशी, ख़ुदग़र्ज़ी, इन्तिक़ाम, उत्तेजना, अपने लिए एक चीज़ पसन्द करना और दूसरे के लिए कुछ और पसन्द करना, यह तमाम चीज़ें नैतिक अर्थों में ज़हरीली ख़ुराकें हैं। आज तमाम लोग चीज़ों को मीठी शक्कर समझ कर खा रहे हैं। मगर वह वक़्त ज़्यादा दूर नहीं जब उनका ज़ेहरीलापन ज़ाहिर होगा, और फिर इन्सान अपने आपको इस हाल में पाएगा कि वहां न कोई उसकी फ़रयाद सुनने वाला होगा और न कोई उसका इलाज करने वाला।

सृष्टि में एकत्व

सृष्टि का अध्ययन बताता है कि पूरी सृष्टि एक केन्द्र के चारों तरफ़ घूम रही है। एटम का एक न्यूक्लियस है और एटम का पूरा ढांचा उस न्यूक्लियस के चारों तरफ़ घूमता है। सौर-मंडल का केन्द्र सूरज है और उसके तमाम गृह-नक्षत्र लगातार उसके चारों तरफ़ घूम रहे हैं। इसी तरह आकाश-गंगा का एक केन्द्र है और आकाश-गंगा के अरबों सितारे इस केन्द्र के चारों तरफ़ घूमते है। यहां तक

कि पूरे ब्रह्मांड का एक केन्द्र है और पूरी फैली हुई सृष्टि इस आख़िरी केन्द्र के चारों तरफ़ चक्कर लगा रही है।

वैज्ञानिकों का अन्दाज़ा है कि सृष्टि का यह केन्द्र एक दिन अपने चारों तरफ़ की चीज़ों को खींचना शुरू करेगा और फिर अकल्पनीय हद तक फैली हुई यह असीम सृष्टि अपने केन्द्र की तरफ़ सिमटना शुरू होगी और आख़िरकार वह वक़्त आएगा कि सृष्टि के सारे पिंड सिमट-सिमट कर एक केन्द्रीय गोले का रूप धारण कर लेंगे, जैसे बिखरी हुई कीलों के बीच चुम्बक लाया जाए और सब कीलें सिमट-सिमट कर उससे जुड़ जाएं।

इस तरह सृष्टि (क़ायनात) जैसे एकेश्वरवाद का व्यावहारिक प्रदर्शन बन गई है। वह अपने व्यवहार और अपनी गति से बता रही है कि इन्सान की ज़िन्दगी को कैसा होना चाहिए। इन्सान की ज़िन्दगी को ऐसा होना चाहिए कि उसकी तमाम सरगर्मियों का सिर्फ़ एक केन्द्र हो और वह एक ख़ुदा हो। आदमी के जज़्बात, उसकी सोच, उसकी सरगर्मियां, उसका सब कुछ ख़ुदा के आगे घूमने लगे।

आदमी अगर अपनी ज़िन्दगी का केन्द्र अपने आपको बनाए तो सृष्टि की गति के हिसाब से वह प्रतिकूल है। इसी तरह अगर वह अपने व्यक्तित्व के बाहर किसी को अपने ध्यान का केन्द्र बनाए तो मौजूदा ढांचा एक हस्ती के सिवा किसी दूसरे की 'केन्द्रीयता' को मानने से इन्कार करता है।

सृष्टि पुकार-पुकार कर कह रही है - 'एक' को अपने ध्यान का केन्द्र बनाओ, न कि एक के सिवा 'कई' को।

सीमाबद्धता का नियम

सृष्टि या क़ायनात का अध्ययन हमें बताता है कि यहां हदबंदी की विशेष व्यवस्था है। हर चीज़ अपने निश्चित और तयशुदा दायरे में रहकर अपना काम

कर रही है। वह अपने दायरे से निकल कर दूसरे दायरे में दाख़िल नहीं होती। यही बात क़ुरान में इन शब्दों में कही गई है:

> "और सूरज, वह अपनी ठहरी हुई राह पर चलता रहता है। यह प्रभुत्वशाली (अज़ीज़) व ज्ञानवान (अलीम) का बांधा हुआ अंदाज़ा है। और चांद के लिए हमने मंज़िलें निर्धारित कर दीं, यहां तक कि वह ऐसा रह जाता है जैसे खजूर की पुरानी शाख़। न सूरज के वश में है कि वह चांद को पकड़ ले और न रात दिन से पहले आ सकती है। और सब एक-एक दायरे में तैर रहे हैं।" (36:38-40)

इन आयतों में उस आकाशीय सच्चाई की तरफ़ संकेत किया गया है कि इस क़ायनात के तमाम घूमने वाले सितारे और सैय्यारे (गृह व नक्षत्र) अपनी-अपनी कक्षा (Orbit) में ठीक-ठीक और सुनिश्चित ढंग से घूमते हैं। वे कभी अपनी हद को छोड़कर दूसरे की हद में दाख़िल नहीं होते।

यही हदबन्दी या सीमाबद्धता इंसान के लिए भी आदर्श है। कुरान में कहा गया है कि जो लोग ख़ुदा की क़ायम की हुई हदों को तोड़ते हैं वे ख़ुदा की नज़र में ज़ालिम (अत्याचारी) हैं। (2:229)

यही बात हदीस में इन शब्दों में कही गई है:

> "और अल्लाह ने हदें क़ायम कर दी हैं। तो तुम उन हदों का उल्लंघन न करो" (अल-मुसतदरक अल-हाकिम, हदीस संख्या 7114)

एक और हदीस में इस बात को मिसाल के ज़रिए इस तरह स्पष्ट किया गया है:

> "मोमिन की मिसाल और ईमान वाले की मिसाल ऐसी है जैसे घोड़ा, जो अपनी रस्सी में बंधा हुआ हो। वो घूमता है फिर वह अपनी रस्सी की तरफ़ लौट आता है।" (मुसनद अहमद, हदीस संख्या 11335)

एक घोड़े की गर्दन में पांच मीटर की रस्सी हो। वह रस्सी एक खूंटे से बंधी हो

तो घोड़ा अपनी आदत के मुताबिक चारों तरफ़ घूमेगा पर वह रस्सी की लम्बाई से ज़्यादा न जा सकेगा। रस्सी अगर पांच मीटर की है तो उसकी हरकत का दायरा भी पांच मीटर तक सीमित रहेगा।

आसमान के सितारे एक अनदेखी रस्सी में बंधे हुए हैं जो उन्हें उनके तयशुदा दायरे (Orbit) से बाहर नहीं जाने देती। इसी तरह इंसान को भी एक नैतिक (अख़लाकी) रस्सी में बांधा गया है। यह रस्सी सही और ग़लत की रस्सी है। उसको सही काम करना है पर ग़लत क़दम नहीं उठाना है। इंसान को इंसाफ़ पर क़ायम रहना है। उसको ज़ुल्म और अत्याचार की इज़ाज़त नहीं उसको जब बोलना है सच बोलना है। झूठ बोलना उसके लिए जायज़ नहीं। उसको अपनी तरक़्क़ी और कामयाबी के लिए प्रयत्नशील रहने की इजाज़त है। पर उसको यह इजाज़त नहीं कि वह दूसरों को नुकसान पहुंचाने की क़ीमत पर अपने लिए फ़ायदा हासिल करे।

इस सत्य को एक चुटकुले द्वारा स्पष्ट किया जा सकता है। एक देश को बाहरी गुलामी से आजादी मिली। उसके बाद वहां का एक 'नागरिक सड़क पर निकला। वह खुशी से झूमता हुआ जा रहा था। और अपने दोनों हाथ ज़ोर-ज़ोर से हिला रहा था। इसी बीच उसका हाथ एक राहगीर की नाक से टकरा गया। राहगीर ने ग़ुस्सा होकर पूछा कि तुम इस तरह हाथ हिलाते हुए क्यों चल रहे हो? उस नागरिक ने जवाब दिया: "आज मेरे देश को आज़ादी मिल चुकी है। अब मैं आज़ाद हूं कि जो चाहूं करूं।" राहगीर ने अहिस्ता स्वर में कहा:

> "तुम्हारी आज़ादी वहां ख़त्म हो जाती है, जहां से मेरी नाक शुरू होती है।"
>
> (Your freedom ends where my nose begins.)

इस देश में हर आदमी को अमल और कर्म की आज़ादी है पर एक शख़्श को हाथ हिलाने की आज़ादी वहीं तक है जहां वह दूसरे की नाक से न टकराए। जैसे ही दूसरे शख्श की नाक से टकराने की हद शुरू हो वहीं हाथ हिलाने वाले की आज़ादी की हद भी ख़त्म हो जाती है।

ख़ुदा की हिफ़ाज़त में

इस्लाम दीने-महफूज़ है, यानी एक सुरक्षित धर्म है। मुसलमान इस दीने-महफ़ूज़ के मानने वाले हैं। मुसलमानों की इस हैसियत ने उनको भी एक महफूज़ और सुरक्षित गिरोह बना दिया है। जिस तरह इस्लाम को मिटाना मुमकिन नहीं उसी तरह मुसलमानों को मिटाना भी मुमकिन नहीं। इस्लाम और मुसलमानों के लिए ख़ुदा की यह हिफ़ाज़त जारी रहेगी, यहां तक कि क़ियामत आ जाए।

मुस्लिम उम्मत के साथ ख़ुदा के इस मामले का इज़हार बार-बार हुआ है। पहले दौर में मक्का में मुसलमानों के ठहरने को नामुमकिन बना दिया गया। ठीक उसी वक़्त मदीना के रूप में अल्लाह ने मुसलमानों के लिए एक ताक़तवर मर्कज़ फ़राहम कर दिया। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम की वफ़ात के बाद अरब क़बीलों में आम बग़ावत पैदा हो गई, जिसको तारीख़ में 'फ़ित्ना-ए-इर्तिदाद' यानी धर्म से फिर जाने का फ़ित्ना कहा जाता है। मगर अल्लाह ने अपनी ख़ास मदद से फ़ित्ने और बुराई के पैदा होते ही उसको ख़त्म कर दिया। ख़िलाफ़ते राशिदा के ज़माने में रोमी साम्राज्य और ईरानी साम्राज्य ने मुसलमानों को ख़त्म करना चाहा मगर अल्लाह की मदद से मुसलमान ख़ुद उन साम्राज्य को ख़त्म करने में कामयाब हो गए। इसके बाद यूरोप की मसीही सल्तनतों ने एकजुट होकर मुस्लिम दुनिया पर हमला कर दिया ताकि शाम (सीरिया) और फ़िलिस्तीन पर क़ब्ज़ा कर लें। मगर दो सौ साल की जंग के बावजूद उनको मुकम्मल शिकस्त हुई।

आख़िरी अब्बासी ख़लीफ़ा के ज़माने में तातारी क़बीलों ने मुस्लिम सल्तनत को ताराज और बरबाद कर दिया। समरक़न्द से लेकर बग़दाद तक तमाम मस्जिदों को ढा दिया। मगर सिर्फ़ पचास साल के अन्दर तारीख़ बदल गई। तातारियों ने इस्लाम क़बूल कर लिया, उन्होंने ढाई हुई मस्जिदों को दोबारा तामीर किया और उन मस्जिदों में सज्दा करके ख़ुदा के सामने अपने इज्ज़ और क्षुद्रता का इक़रार किया।

उन्नीसवीं सदी के मध्य में मुग़ल साम्राज्य ख़त्म हुआ। बीसवीं सदी के आग़ाज़ में उस्मानी ख़िलाफ़त का ख़ात्मा हो गया। बज़ाहिर ऐसा मालूम हुआ कि अब मुसलमानों के लिए दुनिया में कोई मुस्तक़िबल और कोई भविष्य नहीं। मगर दूसरे विश्व-युद्ध के बाद लोगों ने देखा कि दुनिया के नक़्शे पर पचास से ज़्यादा आज़ाद मुस्लिम मुल्क वजूद में आ गए हैं। और तमाम इस्लामी सरगर्मियां नए सिरे से, नई ताक़त के साथ जारी हो गई हैं।

मुसलमानों को उम्मते-मरहूमा और वंचित समाज कहा जाता है। यह बात सही नहीं, बल्कि मुसलमान उम्मते-महफ़ूज़ा (सुरक्षित उम्मत) हैं। यानी उनके अन्दर बिगाड़ के बावजूद उन पर मिटा देने वाला अज़ाब नहीं आएगा, और कोई क़ौम उन पर इतन क़ाबू न पा सकेगी कि वह उनको बिल्कुल मिटा दे। इसका सबब कोई फ़ज़ीलत (मुसलमानों की श्रेष्ठता) नहीं है। यह दुन्यवी हिफ़ाज़त मुसलमानों को पूरी तरह नबूवत की श्रृंखला के ख़त्म होने के कारण से हासिल हुई है।

मौजूदा ज़माने में ख़ुदा की यह सुन्नत बहुत बड़े पैमाने पर ज़ाहिर हुई है। मौजूदा ज़माने में जो मुस्लिम रहनुमा उठे, उन्होंने अपनी ग़लत रहनुमाई से मुसलमानों का यह हाल कर दिया कि वे अपने अन्दर किसी भी क़िस्म की बुनियाद (base) फ़राहम न कर सके। बेशुमार तहरीकें सिर्फ़ उनकी ताक़त और इनर्जी को बरबाद करती रहीं। कोई भी तहरीक उन्हें वक़्त की चीज़ों में

से कोई चीज़ न दे सकी। मगर अल्लाह ने अपने श्रेष्ठ इन्तिज़ाम के तहत उन्हें हर चीज़ फ़राहम कर दी।

लीडरों की ग़लत रहनुमाई के नतीजे में मुसलमान आधुनिक अर्थशास्त्र और आधुनिक अर्थतन्त्र में अपनी जगह न बना सके। ऐसा लगा कि वे आज के ज़माने के शूद्र और ~~प्रद~~दलित बन कर रह जाएंगे। मगर ऐन वक़्त पर तेल का ख़जाना ज़ाहिर हुआ। मुस्लिम मुल्कों की ज़मीन के नीचे अल्लाह तआला ने दुनिया के तेल के ज़ख़ीरों का 50 फ़ीसद से भी ज़्यादा हिस्सा रख दिया। इस क़ुदरती ख़ज़ाने ने मुसलमानों के आर्थिक पिछड़ेपन की भरपाई कर दी।

क़यामत में ऐसे हक़ायक़ और तथ्य छिपे हुए थे जो क़ुरआन के ख़ुदा की किताब होने की पुष्टि करने वाले थे। मगर मुस्लिम लीडर अपने झूठे कामों की वजह से सृष्टि और कायनात की सच्चाई की खोज में न लग सके। अल्लाह तआला ने यह काम पश्चिमी क़ौमों से लिया। उन्होंने प्रकृति और फ़ितरत की सच्चाइयों को खोज निकाल कर इस बात की व्यावहारिक व्याख्या जुटा दी कि हम उनको ज़मीन और आसमान और प्रकृति में अपनी निशानियां दिखाएंगे ताकि उन पर यह खुल जाए कि यह हक़ (सत्य) है (क़ुरआन, 41:53)।

अल्लाह तआला को इस दीन की आवाज़ पूरी ज़मीन के हर छोटे और बड़े घर में पहुंचानी थी (मुसनद अहमद, हदीस संख्या 23814), इसलिए अल्लाह ने फ़ितरत और प्रकृति में यातायात और संचार के साधन छिपा रखे थे। मगर मुस्लिम रहनुमां यहां भी इन चीज़ों को खोजने में नाकाम रहे। अल्लाह तआला ने दूसरी क़ौमों को इस खोज में लगा दिया। यहां तक कि वे तमाम प्रचार-प्रसार के साधन वजूद में आ गए, जिनको प्रिंट मीडिया और इलैक्ट्रानिक मीडिया कहा जाता है। इन साधनों के आ जाने से अब यह बहुत आसान हो गया है कि उनको इस्तेमाल करके इस्लाम की आवाज़ पूरी धरती पर फैला दी जाए।

इस तरह बहुत से पहलू हैं जो बताते हैं कि अल्लाह तआला ने किस तरह अपनी मदद से मुसलमानों की कोताहियों की भरपाई की है। मुसलमानों को चाहिए कि वे ख़ुदा के इस मामले को जानें और उनको इस्तेमाल करते हुए उस ख़िदमते-इस्लाम में लग जाएं जिसके लिए उनके रब ने उनके साथ हिफ़ाज़त और मदद का यह ख़ास मामला फ़रमाया है।

इंसानियत के नमूने

स्वामी विवेकानन्द (1863-1902) ने एक पत्र के जवाब में लिखा था कि मेरा अनुभव है कि अगर कभी कोई धर्म उल्लेखनीय हद तक इन्सानी बराबरी के लक्ष्य तक पहुंचा है तो वह इस्लाम और सिर्फ इस्लाम है। इसलिए मेरा यह स्पष्ट मत है कि व्यावहारिक (अमली) इस्लाम के बिना वेदांत के सिद्धांत, भले ही वे कितने ही अच्छे और शानदार हों, आम इन्सान के लिए बिल्कुल मूल्यहीन हैं। हमारे देश के लिए दो महान व्यवस्थाओं का मिलाप हिन्दुत्व और इस्लाम- वेदांत दिमाग और इस्लाम जिस्म- एक मात्र आशा है। मैं अपने मस्तिष्क की आंख से देख रहा हूं कि भविष्य का आदर्श भारत, अव्यवस्था और फूट से निकल कर वेदांत दिमाग़ और इस्लाम जिस्म के माध्यम से यशस्वी, सफल और अपराजेय बन रहा है।

> My experience is that if ever any religion approached this equality in an appreciable manner, it is Islam and Islam alone. Therefore, I am firmly persuaded that without the help of practical Islam, theories of Vedantism, however fine and wonderful they may be, are entirely valueless to the vast mass of mankind. For our own motherland, a junction of the two great systems, Hinduism and Islam-Vedanta brain and Islam body-is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body.
>
> *Letters of Swami Vivekananda (1986)*, pp. 379-80

महात्मा गांधी कांग्रेसी नेताओं को यह सलाह दिया करते थे कि वे ख़लीफ़ा अबू बक्र और ख़लीफ़ा उमर के आदर्शों पर चलें:

We have to follow the example of Abu Bakr and Umar.

गांधी जी ने एक बार अपने अख़बार 'हरिजन' में लिखा था कि सादगी कांग्रेसियों ही की विरासत नहीं। मैं राम और कृष्ण का हवाला नहीं देता, क्योंकि वे ऐतिहासिक व्यक्तित्व नहीं थे। मैं मजबूर हूं कि अबू बक्र और उमर नाम का उल्लेख करूं। हालांकि वे बहुत बड़ी सल्तनत के शासक थे, पर उन्होंने फकीरों जैसी ज़िन्दगी गुज़ारी।

> Simplicity is not the monopoly of Congresses. I am not going to mention the names of Rama and Krishna because they were not historic personalities. I am compelled to mention the names of Abu Bakr and Umar. Though they were masters of vast empires, yet they lived the life of paupers. (*Harijan*, July 27, 1937)

यह एक सच्चाई है कि इस्लामी शख्सियतों ने इस्लाम के रूप में जो इतिहास बनाया है, वह सारी मानवता के लिए नमूने का इतिहास है। इस्लाम ने उन खूबियों की ऊंची मिसाल क़ायम की है, जिनको इन्सानी खूबियां कहा जाता है। काल्पनिक क़िस्से-कहानियों के रूप में कोई भी व्यक्ति एक किताब लिख सकता है, पर इन्सानियत के नमूने के लिए यथार्थ चरित्र का उल्लेख करना हो तो इस्लामी शख्सियतों के सिवा किसी और का हवाला नहीं दिया जा सकता। इस लिहाज़ से ये इस्लामी शख्सियतें पूरी इन्सानियत की साझा नैतिक विरासत हैं। वे तमाम इन्सानों के लिए बेहतरीन अख़लाक़ी नमूना हैं।

ख़ुदा की तलाश

एक बेहद प्रतिभासम्पन्न आदमी था। वह लगातार इस एहसास में डूबा रहता था कि मैं ज़िन्दगी में अपने सही मुक़ाम को न पा सका। आखिरकार उसने आत्महत्या कर ली। आत्महत्या से पहले उसने अपने पत्र में लिखा थाः

> "मैं अपनी ज़िन्दगी को ख़त्म कर रहा हूं, क्योंकि शायद मैं ऐसी दुनिया में भटक आया जिसके लिए मैं पैदा नहीं किया गया था।"

कमी का यह एहसास ऐसे बहुत से लोगों का पीछा किए रहता है, जो प्राकृतिक रूप से ग़ैर-मामूली ज़ेहन लेकर पैदा हुए हों। वे या तो घोर निराशा और असफलता की ज़िन्दगी गुज़ार कर मरते हैं या आत्महत्या कर लेते हैं। कम बुद्धि और कम प्रतिभा रखने वालों में ऐसे लोग काफ़ी मिल जाएंगे जो प्रत्यक्षतः संतुष्ट जीवन जीते हों, पर ज़्यादा प्रतिभाशाली लोगों में मुश्किल ही से कोई शख़्स मिलेगा, जो संतुष्ट जीवन हासिल करने में सफल हुआ हो।

इसकी वजह इन्सान का आदर्शवाद है। हर इन्सान स्वाभाविक तौर पर आइडियल (आदर्श) की तलाश में है। पर मौजूदा दुनिया में आइडियल को पाना इतना कठिन मालूम होता है कि कहावत बन गई है कि आदर्श कभी हासिल नहीं किया जा सकताः

Ideal cannot be achieved.

अब होता यह है कि कम बुद्धि रखने वालों में चूंकि चेतना बहुत ज़्यादा जागृत नहीं होती, वे आइडियल और ग़ैर-आइडियल के बीच बहुत ज़्यादा फ़र्क़ नहीं कर पाते। वे अपनी मोटी रूचि की वजह से ग़ैर-आइडियल में भी इस तरह व्यस्त हो जाते हैं जैसे कि वह उनका आइडियल हो। पर जो लोग ज़्यादा बुद्धि-सम्पन्न और ज़्यादा ज़हीन हैं वे आइडियल और ग़ैर-आइडियल के फ़र्क़ को

फ़ौरन महसूस कर लेते हैं और इसी लिए आइडियल से कम किसी चीज़ पर अपने को राज़ी नहीं कर पाते।

इन्सान का आइडियल एक ही हो सकता है और वह उसका सृजनहार और पालनहार है। उच्च बुद्धिसम्पन्न लोग जिस चीज़ की तलाश में हैं वे ईश्वरीय मिशन के सिवा कुछ नहीं, ख़ुदा का अस्तित्व ही आइडियल अस्तित्व है। और ख़ुदा के मिशन में अपने को लगा कर ही हम उस चीज़ को पा सकते हैं जो हमारी पूरी हस्ती को संतुष्टि दे और आइडियल के बारे में हमारी मानसिक कसौटी पर पूरी तरह खरा उतरे।

इन्सान का आइडियल उसका ख़ुदा है। पर वह अपने इस आइडियल को 'ग़ैर-ख़ुदा' में तलाश करने का असफल प्रयास कर रहा है।

हज़ार मील का सफ़र

एक चीनी कहावत है कि 'हज़ार मील का सफ़र एक कदम से शुरू होता है' यानी किसी को अगर हज़ार मील दूर जाना है तब भी पहले क़दम ही से उसका सफर शुरू होगा। एक-एक कदम चल कर ही वह अपनी मंज़िल को पहुंचेगा। ऐसा नहीं हो सकता कि पांव उठाते ही वह पहला कदम अपनी आखिरी मंजिल पर रख दे।

यह ज़िन्दगी की एक आम सच्चाई है। इसका ताल्लुक व्यक्ति से भी है और समाज से भी। एक व्यक्ति का सफ़र भी इसी उसूल पर अमल करके 'कामयाब होता है और एक समाज या क़ौम का सफ़र भी।

अगर आप एक लाख रुपए कमाना चाहते हैं तब भी शुरू में आपको एक-एक रुपए की कमाई पर संतोष करते हुए एक लाख की कमाई तक पहुंचना होगा। अगर आप एम० ए० की डिग्री लेना चाहते हैं तो कक्षाओं में मेहनत

करके एम० ए० की डिग्री के क़ाबिल बनना होगा। अगर आप लेखक बनना चाहते हैं तो अध्ययन और शोध की लम्बी यात्रा से गुज़रने के बाद आपको लेखक का स्थान मिलेगा। अगर आप अपने लिए एक ऊंचा मकान देखना चाहतें हैं तो बुनियाद और दीवार का निर्माण करने के बाद ही यह हो सकेगा कि आप अपने लिए एक ऊँचा मकान खड़ा कर सकें।

ठीक यही मामला समाज और राष्ट्र के निर्माण का भी है। समाज का निर्माण इतिहास बनाने वाले भाषणों से नहीं होता, बल्कि इतिहास बनाने वाले कर्म से होता है। समाज व मिल्लत का मज़बूत किला मज़बूत पत्थरों से बनता है न कि शाब्दिक भाषणबाजी और शायराना भावुकता का कमाल दिखाने से।

मौजूदा ज़माने में जो मुस्लिम नेता उठे, हरेक ने किसी न किसी 'मुजाहिदाना प्रयास' से अपने काम की शुरूआत की। हालांकि सही तरीका यह था कि वे वैचारिक सुधार और मानसिक जागरण से अपना काम शुरू करते। यही कारण है शोर भरे हंगामों के बावजूद अब तक कोई नतीजाख़ेज़ काम न हो सका। समाज के निर्माण का काम वैचारिक निर्माण और मानसिकता के सुधार से शुरू होता है, उसको व्यावहारिक पहल (दूसरे शब्दों में छलांग) से शुरू नहीं किया जा सकता।

बड़ों को सभी के जनाज़ों में शामिल होना चाहिए।

मदीने में एक काले रंग की बावली-सी औरत थी। वह मसजिद का कूढ़ा साफ़ किया करती थी। उसका इन्तिक़ाल हुआ तो चन्द लोगों ने उसको दफ़न कर दिया और रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम को इसकी ख़बर न दी। आपको मालूम हुआ तो आपने फ़रमाया कि मुसलमानों में से किसी का इन्तिक़ाल हो जाए तो मुझको उसकी ख़बर दिया करो। और आपने बाद में उसकी नमाज़ जनाज़ा पढ़ी। (सहीह अल-बुख़ारी, हदीस संख्या 458)

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

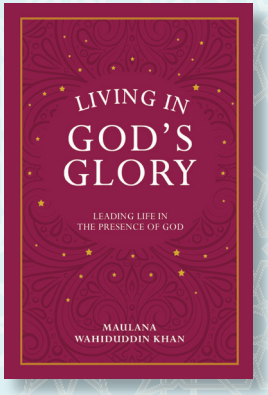

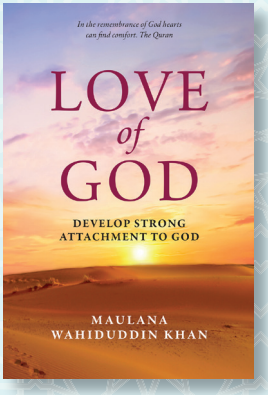

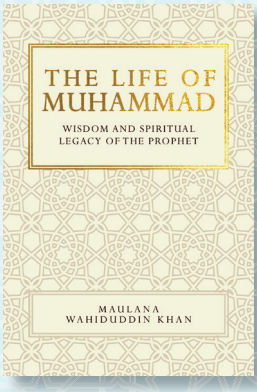

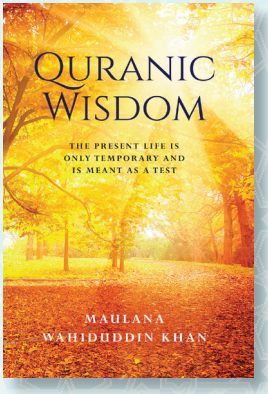

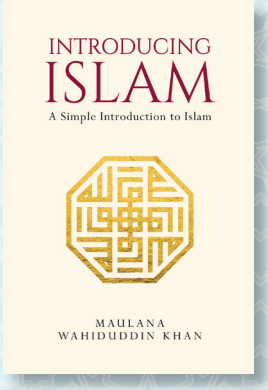

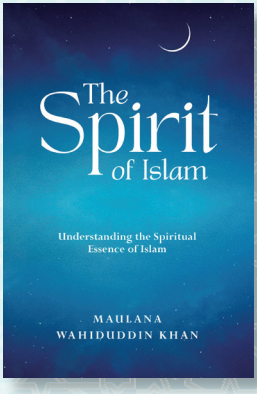

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23